نقوشِ ابو الکلام
و
مقالاتِ آزاد

مولانا عبدالمجید سوہدروی

تزئین وترتیب

محمد ادریس فاروقی

ناشر

مسلم پبلیکیشنز

سوہدرہ (گوجرانوالہ)

ناشر : مسلم پبلیکیشنز   مدیر : حکیم محمد ادریس فاروقی

تقسیم کنندہ

دار السلام
کتاب و سنت کی اشاعت کا عالمی ادارہ
ریاض ○ جدہ ○ شارجہ ○ لاہور
لندن ○ ہیوسٹن ○ نیویارک

ہیڈ آفس : پوسٹ بکس:22743 الریاض:11416 سعودی عرب فون : 4043432 - 4033962 (00966 1)
فیکس :4021659 ای میل: darussalam@naseej.com.sa بک شاپ فون وفیکس: 4614483
جدہ فون: 6712299 فیکس: 02 6173448 الخبر فون: 03 8948106
شارجہ فون : 5511293 فیکس : 5511294 (009716)

پاکستان : ① 50 لوئر مال نزد ایم ۔ اے ۔ او کالج لاہور فون: 7232400 - 7240024 (0092 42)
فیکس: 7354072 ای میل: darussalampk@mail.com
② رحمان مارکیٹ 'غزنی سٹریٹ' اردو بازار' لاہور فون: 7120054 فیکس: 7320703

لندن فون: 5202666 فیکس : 5217645 (0044 208)
ہیوسٹن فون: 7220419 فیکس: 7220431 (001 713) ای میل darsalam@dar-us-salam.com.
نیویارک فون: 7255925 (001 718)
Website: http://www.dar-us-salam.com

ایڈیشن : تیرھواں (13)   طبع : جولائی 2001   تعداد : 2300

مطبع : احمد پرنٹنگ پریس 50 لوئر مال۔ لاہور فون 7240024

کتاب و سنت کا مقام

اصل مرکز حق و یقین کتاب و سنت ہے۔ یہ مرکز اپنی جگہ سے نہیں ہل سکتا۔ سب کو اس کی خاطر ہل جانا پڑے گا۔ اس چوکھٹ کو کسی کی خاطر نہیں چھوڑا جا سکتا' سب کی چوکھٹیں اس کی خاطر چھوڑ دینی پڑیں گی۔ (تذکرہ ....ابوالکلام)

اصحاب حدیث کی عظمت

موجودہ عہد کی مادیت و معقولات کے مقابلے میں بھی صرف اصحاب حدیث و سنت و حاملین علوم خالصہ و ماثورہ سلف ہی کی جماعت و طائفہ منصورہ ہے' جس کے لیے کسی طرح کا بیم و ہراس نہیں۔ (تذکرہ ---- ابوالکلام)

انسانی زندگی کی سب سے بڑی قوت

انسانی زندگی کی سب سے بڑی قوت اس کی سیرت کی فضیلت ہے اگر یہ فضیلت موجود ہو تو اس کے لیے فتح و کامرانی کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔ دنیا کی تمام رکاوٹوں میں سے وہ اپنی راہ نکال لے گا۔ پہاڑ اور سمندر بھی اس کی راہ میں حائل نہ ہو سکیں گے۔ حوادث و وقائع بھی اس پر قابو نہ پا سکیں گے۔

(ترجمان القرآن)
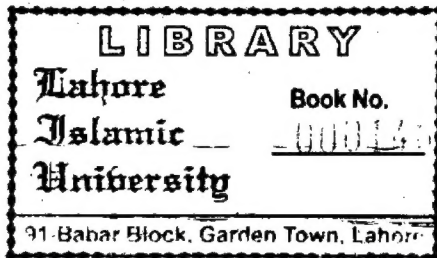
ارباب فکر و دانش کی آراء

جہان اجتہاد میں سلف کی راہ گم ہو گئی
ہے تجھ کو اس میں جستجو تو پوچھ ابوالکلام سے

(ظفر علی خان)

جب سے دیکھی ابوالکلام کی نثر
نظم حسرت میں بھی مزا نہ رہا

(حسرت موہانی)

○ تمام ہندوستان میں ایک عالم تھا جو کم و بیش مجتہدانہ حیثیت رکھنے کا اہل ہو سکتا تھا یعنی ابوالکلام آزاد۔

(علامہ اقبال)

○ اسلام سے جو کچھ میں نے واقفیت حاصل کی تھی وہ اپنے دو مکرموں کا طفیل تھا' ایک اقبال تھا اور دوسرا آزاد۔

(مولانا محمد علی جوہر)

○ مولانا ابوالکلام آزاد ...... ایک ایسے جامع حیثیات بزرگ ہیں جن کی نظیر پیش کرنے سے ہندوستان کی ساری اسلامی دنیا یکسر عاجز ہے۔

(مولانا ظفر علی خان)

○ میں ابوالکلام آزاد کا "الہلال" پڑھ کر مقرر ہوا۔

(نواب بہادر یار جنگ)

○ ابوالکلام کا دماغ کئی ہزار دماغوں کو نچوڑ کر بنایا گیا ہے۔

(مولانا امین احسن اصلاحی)

○ بجز اقبال اور ابوالکلام کے اور کوئی شخص ایسا نہ ملا جو عالم اسلام اور اس کی نیرنگیوں اور رنگ آفرینیوں کا آئینہ دار ہو۔

(پطرس بخاری)

○ مولانا آزاد ایک شریف النفس اور وسیع الظرف انسان تھے۔

(مولانا مودودی)

○ ہندوستانی مسلمانوں کی ادبیات نے تین جامع شخصیتیں پیدا کی ہیں ابوالفضل' اسداللہ خاں غالب اور ابوالکلام آزاد۔

(اختر شیرانی)

○ میرا عقیدہ ہے اگر قرآن نازل نہ ہو چکا ہوتا۔ یا مولانا ابوالکلام کی نثر اس کے لیے منتخب کی جاتی یا اقبال کی نظم ...... میرے نزدیک اقبال اور مولانا ابوالکلام حقیقی معنوں میں فوق البشر ہیں۔

(سجاد انصاری)

○ ہندوستان کے افق پر یکایک ایک زبردست شخصیت مولانا ابوالکلام آزاد کے پیکر میں نمودار ہوئی ...... مولانا صحیح معنوں میں خطابت و انشاء کے ساحر تھے۔

(عبدالحمید صدیقی)

○ اللہ تعالیٰ نے ان کو ذہانت اور حافظہ کی غیر معمولی دولت اور قوت اظہار و بیان کی بے مثال فراوانی عنایت فرمائی ہے ...... ان کو جو کچھ ملا وہ سرا سر عطاء موہبت ہے۔

(سید سلیمان ندوی)

○ نئے افکار کی تربیت و پرورش کے لیے دو نئے مفکر منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئے۔ ایک نے نثر کو اپنے خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا اور دوسرے نے نظم کو ...... میری مراد ابوالکلام اور اقبال سے ہے۔

(مسعود عالم ندوی)

○ مولانا ابوالکلام میں فطری عظمت تھی۔ وہ فلسفیانہ فکر' مجتہدانہ دماغ اور مجاہدانہ جوش عمل رکھتے تھے...... علم و فن کے مجتہد و امام تھے۔

(شاہ معین الدین ندوی)

○ مولانا ابوالکلام آزاد کی ذات غیر معمولی علمیت اور حیرت افزا ذہانت کی حامل تھی' جس پر کبھی جذبات یا تعصب کا غلبہ نہیں ہونے پاتا تھا۔

(جواہر لال نہرو)

○ مولانا آزاد کی طبیعت میں نہ صرف تقلیدی ذہن سے دور رہنے کا رجحان پیدا ہو گیا۔ بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے پیروں اور پیرزادوں کے طرز بود و ماند سے بھی الگ راستہ اختیار کرنے کا خیال ابتداء سے تھا۔

(محمد اجمل خان)

○ مولانا ابوالکلام کی ذات مجموعہ کمالات تھی۔ ان کے کردار کے مختلف نمایاں پہلوؤں میں ایک خاص پہلو استغناء و بے نیازی تھا۔ اور اسی کا اثر تھا کہ ان کی جبین کبھی کسی کے سامنے نہیں جھکی۔

(ڈاکٹر ریاض الدین شیروانی)

○ ابوالکلام اگر تمام مشغولیتوں سے قطع نظر کر کے اپنے آپ کو علم و ادب ہی کے لیے وقف رکھتے تو نہ معلوم آج اردو کے خزانے میں کیسے کیسے قیمتی جواہر کا اضافہ ہو گیا ہوتا...... اس میدان میں ان کا کوئی شریک و سہیم نہیں تھا۔

(مولانا عبدالماجد دریابادی)

○ مولانا ابوالکلام آزاد کے پائے کا مقرر صدیوں سے پیدا نہیں ہوا...... اس میں بجلی کی کڑک' رعد کی گرج' دریا کی روانی' سبزہ زاروں کی طراوت' پہاڑوں کا شکوہ' گلستانوں کا جمال' ناہید کا نغمہ کچھ اس طرح حسین تناسب کے ساتھ گھلا ملا ہوا ملے گا کہ انسان محسوس کرے گا کہ میں وادی کشمیر کی سیر کر رہا ہوں۔

(ملک نصراللہ خاں عزیز)

○ ابوالکلام آزاد ایشیاء کے وہ واحد شخص تھے جنہوں نے نہایت دلیری اور بے باکی کے ساتھ ترکوں کی حمایت کی۔ اور اس حق گوئی کی پاداش میں انگریزوں کی قید و بند کی سختیاں برداشت کیں۔

(عصمت انونو)

○ ابوالکلام کی ذات ہمارے لیے بھی قابل فخر تھی ..... مولانا کی ذات کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ انہوں نے علم کو عمل کے سانچے میں ڈھالا۔ انہوں نے مذہب اور سیاست دونوں کی راہیں روشن کیں۔

(شیخ الازہر)

○ ابوالکلام کے جانے سے ہندوستان ہی نہیں بلکہ ساری دنیا ایک ایسی روشنی سے محروم ہو گئی جس سے انسانی تاریخ کی پر پیچ اور تاریک راہوں کا سراغ لگانا ناممکن ہو جاتا ہے۔

(ٹائن بی)

○ راقم کا یہ عقیدہ ہے کہ اقبال اور ابوالکلام اس صدی کے بہت بڑے مسلمان اور عبقری دماغ تھے۔ ابوالکلام عربوں میں ہوتے تو ابن تیمیہ ہوتے۔ ہندوؤں میں ہوتے تو ان کے بت بجتے۔ مختصر یہ کہ:

آفاقہا گردیده ام لیکن تو چیزے دیگری

(شورش کاشمیری)

○ مولانا ابوالکلام آزاد کی وفات سے وہ بربط ٹوٹ گیا جس کے سازوں سے آزادی کے نغمے ابھرتے اور خوابیدہ روحوں کو بیدار کرتے تھے۔ وہ شعلہ بجھ گیا جو پروانوں کے رقص کا باعث تھا۔ اور وہ بند ٹوٹ گیا جو ہندوستانی مسلمانوں کی حفاظت کا ضامن تھا۔

(عبداللہ بٹ)

○ "سیاسیات" کے کانٹوں میں اپنا دامن الجھانے کے باوجود یہ رجل عظیم اپنے

اصل موضوع "اسلامیات" پر اتنی ہی گہری نظر رکھتا تھا جس کی توقع کی جا سکتی ہے۔

(رئیس احمد جعفری)

○ مولانا ابوالکلام ان اصحاب میں سے تھے جنہیں قدرت صدیوں کے بعد عالم انسانیت کو اپنی خاص نعمت کے طور پر عطا کرتی ہے۔ وہ تحریر و تقریر دونوں اقلیموں کے تاجدار تھے۔ ان کی غیر معمولی صلاحیتیں اس زمانہ میں بھی مشہور فرمانروان علم و فضل کے لیے یکسر حیرت انگیز تھیں جبکہ ان کی عمر ۱۵' ۱۶' برس سے زیادہ نہ تھی۔

(مولانا غلام رسول مہر)

○ میرے دل پر مولانا ابوالکلام کی جس خصوصیت کا اثر سب سے زیادہ ہے وہ ان کی ذہانت اور علمی تبحر ہے ...... انہیں مطالعہ کا بہت شوق تھا۔ وہ ہر قسم کی کتابیں پڑھتے تھے۔ اور ہر فن کے متعلق معلومات رکھتے تھے۔ ان کی تحریر میں خطابت کا انداز ہے اور ان کی تقریر میں انشاء کا اسلوب۔

(چراغ حسن حسرت)

فہرست عنوانات

عرض ناشر

یوں تو امام الہند ابوالکلام آزاد (محی الدین احمد فیروز بخت) کی سیرت و سوانح پر ۲۵۰ کے قریب بہترین کتب زیور طبع سے آراستہ ہو کر ارباب دانش و ادب کو سامان تسکین بہم پہنچا رہی ہیں' سب اپنی اپنی جگہ خصوصیت رکھتی ہیں اور بہت مفید ہیں' مگران کتب میں "نقوش ابوالکلام" کو بوجوہ انفرادیت حاصل ہے:

(۱) اس کتاب میں مولانا آزاد علیہ الرحمۃ کے مسلک سے بحث کی گئی ہے۔ اور بتایا گیا کہ آپ شرک و بدعت سے دور' تقلید و جمود سے نفور اور مسلک قرآن و حدیث کے عامل تھے۔

(۲) کتاب ہذا میں آپ کے سیاسی نظریات کو بڑی جامعیت کے ساتھ آشکارا کیا گیا ہے۔ اور بتایا گیا ہے۔ کہ آپ ہندوستان کو دراصل اسلامستان بنانا چاہتے تھے۔ آپ کی اولین ترجیح برصغیر سے فرنگی کو نکال باہر کرنا تھا۔

(۳) اس کتاب کی ایک یہ بھی انفرادیت ہے کہ ہماری دانست کے مطابق ارض وطن میں منصہء شہود پر آنے والی یہ سب سے پہلی کاوش ہے۔

(۴) "نقوش ابوالکلام و مقالات" کی ایک بہت بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کا مطالعہ کرنے سے مولانا آزاد علیہ الرحمۃ کے بارے میں نفرت کے رذیل جذبات ختم ہو کر اس کی جگہ کشت قلب میں پیار و محبت کے شگوفے پھوٹتے اور پھول کھلتے ہیں۔

(۵) اس کتاب کی ایک خوبی یہ ہے کہ یہ مختصر ہونے کے ساتھ نہایت جامع ہے۔ یعنی جس طرح پھول کے بیج میں حسن' نزاکت' خوشبو اور لطافت سب عناصر یکجا ہوتے ہیں اسی طرح اس کتاب میں مولانا کے بوقلموں خصائص و کمالات نہایت فنکاری سے سمو دیئے گئے ہیں۔ اور کمال یہ کہ اس میں کہیں راہ اعتدال و انصاف کو ترک نہیں کیا گیا۔

"سیرت آزاد نمبر" حضرت مؤلف کی زندگی میں طبع ہوا۔ یہ "جریدہ اہلحدیث" کا آزاد نمبر تھا۔ دوسری بار حضرت والد گرامی مولانا محمد ادریس فاروقی نے اسی کی ترتیب و تبویب و تزئین کر کے ۱۹۸۴ء میں شائع فرمایا۔ تیسرا ایڈیشن حال ہی میں یعنی ماہ مئی ۲۰۰۱ء

میں طبع ہوا' اب ماہ جولائی ۲۰۰۱ء میں ناگزیر حک و اضافہ کے ساتھ اس کا چوتھا ایڈیشن منظر عام پر آیا ہے۔ اس ایڈیشن میں عرض ناشر کے علاوہ والد گرامی کے قلم سے حضرت مصنف کا تعارف اور مولانا محمد اسحاق بھٹی کا "حرفے چند" نام سے جامع تبصرہ آیا ہے۔ اور کتاب کا نام "نقوش ابوالکلام اور مقالات آزاد" رکھا ہے۔ اور اس میں حالات زندگی کے علاوہ مشاہیر کی آراء' اور مولانا ابوالکلام آزاد کے گرانقدر مقالات کا نموذج بھی ہے۔ جس سے یقیناً فائدہ دو چند ہو گیا ہے۔ اور بتوفیقہ کچھ ضروری باتیں بھی آ گئی ہیں۔ یہ ایڈیشن پہلے ایڈیشنوں کی بہ نسبت بہرپہلو تکمیل بردوش ہے۔ بلکہ اس میں مزید خوبصورت اضافہ کیا گیا ہے جو سابقہ ایڈیشنوں کے باہمی تقابل سے معلوم ہو سکتا ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد علیہ الرحمۃ کی سیرت پر یہ کتاب طبع کروانے کا بڑا مقصد یہ ہے کہ ہمارے طلباء و علماء ان کا نمونۂ زندگی اپنے سامنے رکھ کر علم و ادب کے زینے طے کریں۔ اپنے اندر تحریر و تقریر کا ملکہ اور رسوخ فی العلم پیدا کریں۔ مولانا آزاد کی طرح صرف ایک بارگاہ میں جھکیں اور محض قرآن و سنت کا اتباع کریں۔ جن لوگوں نے ابوالکلام کا انداز اپنایا بے شک انہوں نے بڑا رتبہ پایا۔ ٹھیک ہے کسب' وھب کو نہیں پہنچ سکتا۔ کسب کسب ہے اور وھب وھب۔ مگر پھر بھی آدمی کچھ نہ کچھ چربہ تو اختیار کر ہی لیتا ہے اور اس طرح بھی آخر فائدہ ہی ہے۔ باکمال لوگوں کا چربہ اختیار کرنا بھی اک کمال ہے۔

ادارہ مسلم پبلی کیشنز سوہدرہ /لاہور نے اس کتاب کو خاص اہتمام سے شائع کیا ہے تاکہ عوام و خواص اس سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کر سکیں۔ دعا ہے کہ اللہ بزرگ و برتر اس کتاب کو ملک و ملت کے لیے نافع بنائے۔ آمین۔

(مخلص قمرالحمید فیصل)
مینجر مسلم پبلی کیشنز سوہدرہ (گوجرانوالہ)

مصنف کا تعارف

اگرچہ مصنف کتاب ہٰذا کی ذات تعارف کی محتاج نہیں' کیونکہ اسلامی اور طبی لائن میں ان کا کافی شہرہ ہے لیکن نئی جنریشن تقریباً ان سے نا آشنا ہے۔ حضرت مولانا عبدالمجید سوہدروی تین رسالوں کے ایڈیٹر اور اسلامی و طبی تقریباً پچاس سے زائد کتابوں کے مصنف تھے۔ علاوہ ازیں آپ ہر دل عزیز خطیب تھے۔ برصغیر کا شاید ہی کوئی شہر یا گاؤں ایسا ہو جہاں آپ نے قرآن و سنت کے زمزمے بلند نہ کئے ہوں۔

ایک مرتبہ بندہ زمانہ طالب علمی میں حضرت مولانا حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب سے ملنے کے لیے فیصل آباد گیا اتفاق سے وہیں جماعت احرار کے مشہور خطیب مولانا تاج محمود فیصل آبادی بھی تشریف لے آئے۔ محترم حکیم صاحب نے ان سے بندہ کا تعارف کرایا تو انہوں نے ایک آہ سرد بھری اور فرمایا: کہ حضرت مولانا عبدالمجید سوہدروی اس قدر مقبول خطیب تھے کہ پاک و ہند کا کوئی جلسہ ایسا نہیں تھا جس میں وہ مدعو نہ ہوں' آپ نصف صدی میں منعقد ہونے والے جلسوں کا کوئی بھی اشتہار اٹھا کر دیکھ لیں اس میں مولانا سوہدروی کا نام ضرور ہو گا"۔

سوہدرہ وزیر آباد سے جانب مشرق سیالکوٹ روڈ کے قریب ایک قصبہ ہے وہاں اگرچہ بڑے بڑے ارباب فکر و دانش و اصحاب فضل و کمال پیدا ہوئے جن کی وجہ سے سوہدرہ کا نام کافی روشن ہوا' مگر سوہدرہ کو برصغیر پاک و ہند میں صحیح طور پر حضرت مولانا سوہدروی علیہ الرحمہ نے متعارف کرایا۔ ہماری خواہش ہے کہ "تاریخ سوہدرہ" نام سے ایک کتاب مرتب کریں۔ ان شاء اللہ اس کتاب میں سوہدرہ کے قابل ذکر لوگوں کا ذکر کیا جائے گا۔ اور امید ہے وہ کتاب قبول عام کا درجہ حاصل کرے گی۔

حضرت مولانا عبدالمجید سوہدروی روایتی "مولوی" نہ تھے بلکہ متبحر عالم دین' بڑے وضعدار و طرح دار طبیعت کے مالک' صاحب جلال و جبروت' بڑے زیرک' مدبر اور بلند حوصلہ' مختصر یہ کہ ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے اور اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔ اور سیاست میں بھی اونچاپایہ رکھتے تھے۔ آپ ٹھیک ٹھاک زمیندار تھے۔ آپ اپنے وقت کے بہت بڑے "عامل" ہونے کے علاوہ روحانی بزرگ اور حامل قرآن و سنت تھے۔ علم طب میں بڑا شہرہ رکھتے تھے۔ تشخیص و تجویز میں آپ وحید العصر تھے۔

آپ بہترین مفسر قرآن تھے۔ کبھی کبھی خطبات جمعہ میں بعض آیات اور قرآنی سورتوں کی اتنی دلنشیں تفسیر فرماتے اور اس سوز سے قرآن پڑھتے کہ واللہ! یوں لگتا تھا جیسے قرآن ابھی نازل ہو رہا ہو' آپ کی جامع مسجد نمازیوں اور سامعین سے کھچا کھچ بھری ہوئی ہوتی تھی۔ آپ کے منبر پر جلوہ افروز ہونے سے قبل لوگ آپ کے منتظر ہوتے تھے ((الا الغافلون)) آپ کی تقریر میں سب رنگ ہوتے تھے' قرآن و حدیث' تاریخ و سیر' شعرو ادب' عالمی و ملکی سیاست' حالات حاضرہ' علاقائی مسائل وغیرہ ...... آپ کا بڑا موضوع اصلاح معاشرہ ہوتا تھا۔ آپ حکومت اور معاشرہ پر بے لاگ تبصرہ کرتے تھے تا آنکہ بسا اوقات خوف آنے لگتا تھا کہ کہیں آپ کی گرفتاری نہ ہو جائے یا معاشرے کے سود خوروں' جوا بازوں' بلیک میلروں (Black Malers)' چوروں' ڈاکوؤں' لٹیروں اور دین و اخلاق کے دشمنوں میں سے کوئی آپ کی عزت کو مجروح نہ کر دے' مگر ہمیشہ اللہ کا فضل و کرم رہا' کسی کو آپ کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی بھی جرأت نہ ہوئی۔ آپ کے دبدبہ و طنطنہ کے سامنے کسی کو دم مارنے کی مجال نہ تھی۔ اور اس بات میں ذرا مبالغہ نہیں کہ اس رعب و جلال اور شان و شوکت کا حامل عالم کم ہی دیکھنے یا سننے میں آیا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو رعب و جلال ایسا دے رکھا تھا کہ بڑے بڑے لوگ آپ کے سامنے دم بخود نظر آتے۔ جب آپ پر رنگ جلال غالب آتا تو محفل میں سناٹا طاری ہو جاتا اور جب رنگ جمال میں ہوتے تو

یوں لگتا جیسے حلقہ یاراں میں نسیم محبت کے جھونکے اٹھکیلیاں لے رہے ہوں۔ اور اکثر آپ کی پیاری باتوں سے محفل زعفران زار بن جاتی۔

آپ کا انداز بیان منفرد تھا۔ جس میں سلاست و طلاقت' علم و ادب' جلال و جمال' متانت و بذلہ سنجی' اجمال و تفصیل' طنز و ظرافت' ایجاز و اطناب' مذہب و سیاست کا حسین امتزاج ہوتا۔ اور کمال یہ کہ آپ کے بیان میں تکلف و تصنع نام کی کوئی چیز نہ ہوتی۔ آپ کی ہر بات اور ادا میں بے ساختہ پن پایا جاتا' آپ جو کہتے علیٰ وجہ البصیرت کہتے' دل سے کہتے' جذبہ ہمدردی کے تحت کہتے۔ اور یوں لگتا جیسے آپ اپنے دل کی باتوں کو سامعین کے دل میں انڈیل رہے ہوں۔ اسی کو جذب و تاثیر کہتے ہیں۔ موجودہ دور کی تقاریر میں بہت کچھ ہوتا ہے مگر معلومات اور جذب و تاثیر کی کمی ہوتی ہے۔ وہاں ایسی کوئی کمی نہ تھی۔ آپ جب کبھی بیٹھتے تھے لوگ آپ کی پر از معلومات علمی' تاریخی سوانحی' ادبی' فقہی' طبی اور دانشورانہ باتیں سننے کے لیے آپ کے گرد جمع ہو جاتے تھے۔ بندہ نے اپنی آنکھوں سے آپ کی محافل دیکھی ہیں۔ آپ میں ایک کمال یہ تھا کہ آپ بر سر منبر ہوں یا اسٹیج پر' ٹیبل ٹاک (Table Talk) ہو یا انفرادی گفتگو' لوگ آپ سے بہت محظوظ ہوتے' مطلق بور نہ ہوتے۔ اور اپنے دامن کو علم و ادب کے رنگا رنگ پھولوں سے بھر کر لے جاتے۔

آپ خاندانی اعتبار سے بھی نجیب الطرفین تھے۔ آپ دودمان علوی کے روشن چراغ تھے۔ آپ کا سلسلۂ نسب تیس واسطوں سے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جا ملتا ہے۔ آپ کے والد گرامی مولانا عبدالحمید' استاد پنجاب حافظ عبدالمنان محدث وزیر آبادی کے داماد تھے۔ آپ کے دادا حضرت مولانا غلام نبی الربانی جنہیں لوگ احتراماً "جی صاحب" کہتے تھے اور ان کا نام لینا سوء ادبی خیال کرتے تھے' اپنے وقت کے یگانۂ روز گار عالم اور ولی کامل تھے۔ آپ کے پردادا مولانا محبوب عالم اور ان کے والد حافظ غلام حسین واجب الاحترام سپوت تھے۔ ان کے بزرگ حضرت مولانا حبیب اللہ بڑے اہل اللہ تھے۔ یہ سب لوگ زہد و ورع میں اونچا پایہ رکھتے تھے۔ حضرت مولانا

حبیب اللہ علیہ الرحمۃ کا مدفن سانتل (Santal) (گجرات) میں مرجع خلائق بنا ہوا ہے جس کی جہلا پرستش کرتے ہیں۔ اگر حضرت مولانا عبدالمجید سوہدروی چاہتے تو بے پناہ دولت اکٹھی کر سکتے تھے۔ علم و فضل' خاندانی وجاہت اور علاقائی شہرت غرض ہر نعمت انہیں حاصل تھی۔ مگر انہوں نے توحید و سنت پر ہر شئے نثار کر دی۔ اور زندگی بھر شرک و بدعت اور کفر و عصیان سے ٹکر لی۔ اور شرک و بدعت کی بلند و بالا عمارتیں توحید و سنت کے تیشوں سے توڑ پھوڑ کر رکھ دیں۔

آپ کے دینی معلم امام العصر حضرت محمد ابراہیم میر سیالکوٹی اور روحانی استاد حضرت مولانا قاضی محمد سلیمان منصوری پوری اور تقریر و ادب کے آئیڈیل (Ideal) حضرت مولانا ابوالکلام آزاد علیہ الرحمۃ تھے۔ آپ کی تربیت عالم بے بدل اور ولی کامل یعنی آپ کے اپنے ہی جد محترم حضرت مولانا غلام نبی الربانی نے فرمائی۔ آپ حضرت مولانا احمد علی لاہوری علیہ الرحمۃ کے داماد تھے۔ باب تقویٰ میں حضرت لاہوری کا بھی آپ پر عکس پڑا۔ یہی وجہ ہے کہ مشکوک کھانا' اور بے نماز کے ہاتھ کی پکی ہوئی روٹی نہیں کھاتے تھے اور ایسی دعوت قبول نہ کرتے تھے جس پر بینڈ باجے بجائے گئے ہوں یا خلاف شرع کوئی کام کیا گیا ہو۔ اور اس سلسلے میں کسی وڈیرے اور نواب کو بھی خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ پوری زندگی مسجد کی خدمات کا معاوضہ نہیں لیا۔ سب دینی کام بے لوث کرتے تھے۔ آپ دبک کر نہیں رہے بلکہ آپ نے دبا کر رکھا۔ اور مسجد کا پورا انتظام اپنے ہاتھ میں رکھا۔

آپ بہترین مفتی' صاحب طرز ادیب' ممتاز صحافی' یکتا مدرس اور منفرد مناظر تھے۔ آپ کے فتاویٰ عنقریب طبع ہو رہے ہیں۔ جن سے آپ کی وسعت علمی اور ژرف نگاہی کا اندازہ ہوتا ہے۔ آپ کے ادب و انشاء پردازی اور انداز صحافت معلوم کرنے کے لیے آپ کے جرائد و رسائل "مسلمان" "جریدہ اہلحدیث" ' "طبی میگزین" اور آپ کی تصانیف کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ کسی وقت آپ کے مقالات کو احاطۂ تحریر میں لائیں۔ خصوصاً اس میں آپ کے اداریئے

اور ہنگامی اور اہم موضوعات پر مشتمل شہ پارے یکجا کریں۔ ہمیں امید ہے کہ وہ قومی سطح پر ایک مفید کاوش ہو گی۔ آپ کے سوانحی خاکے اور آپ کی سیرت جو آج کل زیر ترتیب ہے' یہ سب چیزیں اس میں آئیں گی۔

آپ جنوری ۱۹۰۱ء کو پردۂ کتم سے عالم شہود میں رونق افروز ہوئے۔ آپ دود مان علوی سے تعلق ہی نہ رکھتے تھے بلکہ اس عظیم خاندان کا گل سرسبد تھے۔ آپ ذہن رسا لے کر آئے۔ آپ نے قلیل مدت میں زینۂ ارتقاء کے مدارج طے کیے۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے ہمدوش ثریا و کہکشاں ہو گئے۔ آپ سولہ برس کی عمر میں اچھے خطیب' عمدہ ادیب' اور ماہنامہ کے مدیر اور یگانہ طبیب بن گئے۔ اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ آپ کے ہر فن میں نکھار پیدا ہوتا چلا گیا۔ آپ کی تیغ نطق نے بڑے بڑے جغادریوں کو گھائل ہی نہیں کیا بلکہ مائل کر لیا' تا آنکہ انہیں اپنا حلقۂ اسیر دام بنا دیا۔ آپ کی قوت بیان اور زور استدلال اپنی مثال آپ تھا۔ جس کا آپ کے معاصرین کو بھی اعتراف تھا۔

حضرت مولانا عبدالمجید سوہدروی پہلے اچھرہ لاہور میں خطیب تھے' اسی علاقے میں مولانا مودودی اور بریلوی مسلک کے مشہور واعظ اور مناظر مولانا محمد عمر اچھروی بھی تھے۔ حضرت مولانا سوہدروی مرحوم کے ان دونوں سے روابط تھے۔ باہمی اختلاف مسائل کے باوجود یہ ایک دوسرے کا احترام کرتے تھے۔ ادھر مسلم مسجد کے خطیب مولانا محمد بخش مسلم کا بھی مولانا سوہدروی سے دوستانہ تھا۔ یہ شروع میں دیوبند اور بریلی کے درمیان کی راہ پر تھے اخیر بریلی کی جانب میلان ہو گیا۔ مولانا عبدالمجید سوہدروی علیہ الرحمۃ میں ایک خوبی یہ تھی کہ ہر مکتب فکر کے علماء سے ان کے روابط تھے مثلاً مولانا عبدالرحمٰن جامی گوجرانوالہ' مولانا محمد بشیر قبرستان روڈ گوجرانوالہ' مولانا عبدالغفور ہزاروی وزیر آباد' صاحبزادہ فیض الحسن آلومہار' مولانا ابوالحسنات لاہور وغیرھم۔ آپ ہنس مکھ' زندہ دل' وسیع الظرف تھے۔ آپ کو اللہ تعالیٰ نے طنز و ظرافت سے حظ وافر عطا فرمایا تھا۔ بلکہ اگر آپ کو طنز و ظرافت کا بادشاہ

کہہ دیا جائے پھر بھی ناموزوں نہ ہو گا۔ بات سے بات پیدا کرنا آپ کا فن تھا۔ آپ وسیع معلومات رکھتے تھے۔ گفتگو اور تقریر میں کمال حاصل تھا۔ ان سب باتوں کے ساتھ ساتھ بڑے عابد' صاحب اتقا اور مسلک اہلحدیث کے حامل و عامل اور بہترین داعی تھے۔ آپ کے تفصیلی حالات آپ کی سوانح حیات میں بیان ہوں گے۔ اور اس طرح کی متفرق معلوماتی باتیں وہاں ذکر کی جائیں گی۔ فی الحال ہم یہ بتا رہے ہیں کہ علمائے اہل حدیث اور علمائے دیوبند تو آپ کو بنگاہ احترام دیکھتے تھے ہی' علمائے بریلی بھی آپ کے قدردان تھے۔ آپ کے بریلوی اجتماعات میں کئی مرتبہ خطابات ہوئے جو بہت پسند کئے گئے۔ آپ نے سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے ساتھ ایک اسٹیج پر کئی مرتبہ تقریریں کی۔ اسی طرح سید عنایت اللہ شاہ بخاری گجرات' قاضی شمس الدین گوجرانوالہ' قاضی احسان احمد شجاع آبادی' مولانا محمد علی جالندھری مولانا مفتی محمود' مولانا غلام غوث ہزاروی وغیرھم سے آپ کے اچھے تعلقات تھے۔ مولانا احمد علی لاہوری کا داماد ہونے کی وجہ سے سب ارباب دیوبند آپ کی بہت عزت کرتے تھے۔

آپ جب لاہور سے سوہدرہ منتقل ہوئے تو آپ کی آمد نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔ اور جن لوگوں پر آپ کے دادا جان مرحوم نے محنت کی تھی آپ نے اپنی تبلیغی مساعی کی بدولت انہیں راسخ العقیدہ بنا دیا۔ پوری گکے زئی برادری اہل حدیث ہو گئی۔ پورا گاؤں تلواڑہ اہل حدیث ہو گیا۔ گویا سوہدرے اور آس پاس توحید و سنت کے چرچے ہونے لگے۔ زبانی دعوت و تبلیغ کے علاوہ آپ نے بذریعہ اخبار اور کتب بہت تبلیغ فرمائی۔ آپ کی کافی تصنیفات ہیں۔ آپ کی گراں قدر تصنیفات میں ایک "سیرت آزاد" بھی ہے۔ "جریدہ اہل حدیث" کے اس "سیرت آزاد نمبر" کو ہم نے نوک پلک درست کر کے' ناگزیر اور معمولی سے حک و اضافہ کے ساتھ اب "نقوش ابوالکلام" نام سے شائع کیا۔ اور دور حاضر کے طباعتی معیار کو پیش نظر رکھ کر اسے بازار علم و ادب میں پہنچا دیا۔ شائقین نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک۔

مئی ۲۰۰۱ء میں طبع ہونے والی یہ کتاب جولائی ۲۰۰۱ء میں دوبارہ پرنٹ کروانا پڑی

جو اس وقت آپ کے مشاق ہاتھوں میں ہے۔ ہمیں معلوم ہے کچھ لوگوں کو مولانا آزاد کی دو چار باتوں سے اختلاف رہا ہے۔ اور اب بھی ہے مگر اختلاف ہونا کوئی بری بات نہیں۔ اور ہم خود کہتے ہیں کہ ابوالکلام کوئی معصوم عن الخطاء نہیں تھے' ان ہی کی ذات سے نہیں بلکہ نبی کے علاوہ ہر ایک سے اختلاف کی گنجائش رہی ہے اور رہے گی' مگر ابوالکلام کی ذہانت و فطانت' ادب و انشاء' تفسیر و تفقہ' استحضار و حاضر دماغی' ذہنی اپج' عزت نفس' اخلاقی جرأت' آزادی رائے' اصول پسندی' متانت و سنجیدگی' استعداد و صلاحیت' رنگ آفرینی و بو قلمونی' قوت حافظہ' طریق استدلال' نیرنگی خیال' ندرت بیان' اعجاز آفریں خطابت' بے خوفی و بے باکی' قادر الکلامی' اظہار مافی الضمیر پر کامل قدرت' اعلائے حق و صداقت' سیاسی تدبر و بصیرت' عبقریت' استغناء و بے نیازی' عالی دماغی و وسعت ظرفی اور باغ و بہار طبیعت اور ایسی گوناں گوں صفات کے بارے میں کسے شبہ ہو سکتا ہے؟ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ۔

حضرت مولانا عبدالمجید سوہدروی علیہ الرحمۃ بھی دیگر ارباب دانش کی طرح ابوالکلام آزاد کی ابہت و رنگا رنگی اور طبع پر بہار سے متاثر تھے۔ آپ اکثر ان کا ذکر کرتے رہتے تھے کہ خدا داد صلاحیت کی بدولت چودہ ہی برس میں برصغیر پاک و ہند میں ان کا طوطی بولنے لگا۔ اور کہتے تھے اگرچہ مولانا ابوالکلام آزاد کے شمائل و خصائل موہبت الہیہ تھے مگر ہے کوئی دیدہ ور جو علم و ادب کی لائن میں انہیں اپنا آئیڈیل بنائے؟

"نقوش ابوالکلام" طبع کروانے سے ہمارا بڑا مقصد یہی ہے کہ لوگ اس نابغہ روز گار شخصیت سے علو و بلند ہمتی کا سبق لیں۔ خصوصاً طلبہ اور نوجوان علماء ان کی روش پر گامزن ہو کر عروج و ارتقاء کی منازل طے کریں اور ملک و قوم کی بیش از بیش خدمات بجا لائیں۔

مصنف "نقوش ابوالکلام" حضرت مولانا عبدالمجید سوہدروی نے بھی زندگی کی ۵۹ بہاروں میں وہ کارہائے نمایاں سرانجام دیے کہ دور حاضر میں اس کی خال خال

مثال ملے گی ...... آپ نے نومبر ۱۹۵۹ء میں لاہور میں وفات پائی۔ اور سوہدرہ میں آپ کی تدفین ہوئی۔

آپ کے بعد آپ کی اولاد و احفاد نے آپ کے مشن اور کاز کو جاری رکھا۔ بحمداللہ سوہدرہ سے "مجلہ ضیائے حدیث" بھی شائع ہو رہا ہے اور کتب بھی طبع ہو رہی ہیں۔ علاوہ ازیں "جامعہ اصحاب صفہ" اور "طبی ادارہ سوہدرہ" بھی ملکی و قومی خدمات سرانجام دے رہا ہے۔ اللہ کے فضل و رحمت سے تیس سے زائد کتب Reprint یعنی دوبارہ شائع ہو کر اربابِ ذوق سے داد تحسین وصول کر چکی ہیں۔ سوہدرہ اور حوالئے سوہدرہ میں "جامعہ اصحاب صفہ" اور "فہم قرآن اکیڈمی" کے تحت قرآن و سنت کی خدمات سرانجام دی جا رہی ہیں۔ جس کے نتائج رفتہ رفتہ سامنے آ رہے ہیں۔ بحمداللہ شرک و بدعت کے دبیز و تاریک پردے چاک ہو رہے ہیں اور توحید و سنت کا نور پھیل اور بکھر رہا ہے۔ اور بقول شاعر؎

آخرش جاگ اٹھا وقت کا خوابیدہ شعور
اور سالہا سال کی ظلمت کا فسوں ٹوٹ گیا

دعا فرمایئے۔ اللہ تعالیٰ اس تگ و تاز میں اور برکت ڈالے۔ اور ان مساعی کو مشکور فرمائے۔ آمین یا رب العالمین۔

مخلص

محمد ادریس فاروقی ۲۰۰۱۔۷۔۱۵

نبیرہ حضرت مولانا عبدالمجید سوہدروی علیہ الرحمۃ

حرفِ چند

متحدہ پنجاب کے دور ہی سے متعدد اعتبارات سے گوجرانوالہ کے علاقے کو خاص شہرت حاصل رہی ہے۔ اس علاقے میں بہت سے علمائے دین پیدا ہوئے۔ بے شمار ادیبوں، مصنفوں، صحافیوں اور شاعروں نے اس علاقے میں جنم لیا۔ خطیبوں اور مقرروں کی بہت بڑی جماعت اس سرزمین سے ابھری۔ بعض مشہور فلسفی اس علاقے کی مٹی سے نمودار ہوئے۔ سیاست دانوں کا اچھا خاصا گروہ اس شہر اور ضلع سے عالم وجود میں آیا، ایسی ہی نابغۂ روزگار ہستیوں میں ایک حضرت مولانا عبدالمجید سوہدروی علیہ الرحمۃ تھے۔ بیشک آپ ضلع گوجرانوالہ کے اصحاب علم و فضل اور ارباب فکر و دانش کے ماتھے کا جھومر تھے۔ سیرت آزاد پر یہ کتاب مرحوم ہی کی تصنیف کردہ ہے۔ جو آپ کی وسعت معلومات کا پتہ دے رہی ہے۔ آپ اور آپ کی کتاب کا ہم بعد میں ذکر کریں گے۔ فی الحال علاقہ گوجرانوالہ کے دیگر لوگوں کا ذکر کر رہے ہیں۔

علاوہ ازیں یہاں کے پہلوانوں کی ایک کھیپ نے اپنی طاقت کا مظاہرہ کیا اور اپنے کمال فن کے جوہر دکھا کر دور دور تک شہرت پائی۔ دور ماضی کے پنجاب کے ایک حکمران رنجیت سنگھ کا تعلق اسی علاقے سے تھا۔ مشہور فلسفی اور شاعر سوامی رام تیرتھ ضلع گوجرانوالہ کے ایک گاؤں "مرالی والا" کا باشندہ تھا جو ۲۳/ اکتوبر ۱۸۷۳ء میں پیدا ہوا۔ تعلیم حاصل کرنے کے بعد جاپان گیا، امریکہ گیا۔ ۲۰ / مئی ۱۹۰۳ء کو امریکی صدر روز ویلٹ سے ملا۔ یہ نہ صرف گوجرانوالہ کا بلکہ پنجاب کا پہلا شخص تھا جس نے امریکی صدر سے ملاقات کی۔ پھر جبرالٹر کے راستے سے مصر پہنچا اور قاہرہ کی جامع مسجد میں اس کے لیکچر کا اہتمام کیا گیا۔ وہ فارسی زبان پر عبور رکھتا تھا۔ اس نے جامع مسجد میں فارسی زبان میں تقریر کی جو وہاں کے اس وقت کے مشہور اخبار "الوہاب" نے "ایک ہندی فلاسفر کے افکار" کے عنوان سے شائع کی۔ سوامی رام

تیرتھ دریائے گنگا میں اشنان کرتا ہوا' ڈوب گیا تھا۔ یہ ۱۹۰۶ء کا واقعہ ہے۔

علامہ اقبال کو جو خود بھی بہت بڑے فلسفی تھے' گوجرانوالہ کے اس فلسفی شاعر سے بے حد لگاؤ تھا۔ انہوں نے اس کے متعلق "سوامی رام تیرتھ" کے عنوان سے "بانگ درا" میں نظم لکھی۔

غرض مختلف اوصاف کے ممتاز انسانوں کی پیدائش کے لحاظ سے یہ علاقہ نہایت زرخیز اور بے حد پر ثروت ہے۔ لیکن یہاں اس کی تفصیل میں جانا مقصود نہیں۔ موضوع کی مناسب سے اس ضلعے کے ایک قصبے (سوہدرے) کے صرف ایک خاندان کے چند بزرگان عالی قدر کا تذکرہ مقصود ہے' جو حافظ غلام حسین اور مولانا محبوب عالم اور حضرت مولانا غلام نبی الربانی سے لے کر حافظ بابر وحید' حافظ نعمان فاروقی اور حافظ اسید تک پہنچتا ہے۔ جن کا تعلق خالص زمرۂ علمائے دین اور دودمان علوی کے حفاظ کرام سے ہے' تاہم تمہید کے طور پر اس سے قبل ضلعے اور شہر کے بعض دیگر علمائے ذی احترام کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔

ان حضرات میں حضرت مولانا غلام رسول (قلعہ میہاں سنگھ) کا اسم گرامی خاص اہمیت کا حامل ہے' جو پیکر صلاح و خیر اور مستجاب الدعوات بزرگ تھے۔ پھر ان کے شاگرد مولانا علاؤ الدین کا نام نامی آتا ہے' جن کا اگرچہ پیدائشی تعلق گوجرانوالہ سے نہیں تھا' لیکن انہوں نے یہیں زندگی گزاری تھی اور شہر کی جامع مسجد اہل حدیث جو چوک نیائیں میں واقع ہے' انہی کی سعی مسلسل سے تعمیر ہوئی تھی۔ یہی وہ مسجد ہے' جس میں ۱۹۲۱ء میں حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی نے درس و خطابت کا سلسلہ شروع کیا اور توحید و سنت کی تبلیغ کو اپنا موضوع قرار دیا۔ مولانا کے اسلوب تبلیغ اور نہج کلام سے گوجرانوالہ کو اہل حدیث کے بہت بڑے مرکز کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ ان کی وفات کے بعد شیخ الحدیث مولانا عبداللہ نے اس مسجد کا منبر سنبھالا اور اپنے انداز سے جماعت کی بہت اچھی خدمت کی۔

یہی شہر حضرت علامہ حافظ محمد محدث گوندلوی کا مسکن رہا۔ ان کی بارگاہ علم میں

بڑے بڑے اصحاب فضل کی گردنیں جھک جاتی تھیں۔ علم و ادراک میں اللہ تعالیٰ نے ان کو بڑی رفعت شان سے نوازا تھا۔

پھر اسی شہر سے مولانا محمد حنیف ندوی کا تعلق تھا۔ آپ کو شیخ الحدیث مولانا محمد اسماعیل سلفی کی شاگردی کا فخر بھی حاصل ہے۔ وہ پنجاب کے علمائے اہل حدیث میں پہلے عالم دین ہیں' جنہوں نے ۱۹۳۴ء میں اردو میں پورے قرآن مجید کی تفسیر لکھی جو اس دور کے کشمیری بازار لاہور کے ناشر ملک سراج الدین نے "سراج التفاسیر" کے نام سے شائع کی۔ ان سے قبل پنجابی نظم میں پورے قرآن کی تفسیر حافظ محمد لکھوی نے تحریر فرمائی تھی۔ مولانا محمد حنیف ندوی کا پایۂ علمی بہت بلند تھا۔ جماعت اہل حدیث کے مشہور بزرگ قاضی عبدالرحیم کا مسکن بھی یہی شہر رہا۔ وہ ایک درویش منش اور گوشہ گیر عالم تھے۔ مختلف میدان ہائے کار میں انہوں نے بے حد تگ و تاز کی۔ ان کا تذکرہ ایک مستقل مضمون کا متقاضی ہے۔ مولانا نور حسین گھرجاکھی' مشہور واعظ و مقرر اور مناظر تھے۔ وہ بھی یہیں کے رہنے والے تھے۔

احناف کے دیوبندی مکتب فکر کے مرحوم اہل علم میں سے مولانا عبدالعزیز' مولانا عبدالواحد اور مولانا محمد چراغ کا شمار یہاں کے معروف حضرات میں ہوتا ہے۔ شیعہ مکتب فکر کے مفتی جعفر حسین یہیں کے باشندے تھے' جنہوں نے مولانا محمد اسماعیل سلفی اور مولانا قاضی عبدالرحیم سے بھی استفادہ کیا تھا۔ مفتی صاحب کے مولانا عبدالمجید سوہدروی سے بھی مراسم تھے۔ مفتی صاحب دو ایک مرتبہ حضرت مولانا سوہدروی علیہ الرحمۃ سے بغرض ملاقات و تبادلۂ علمی سوہدرے بھی گئے۔

ان چند حضرات کے ذکر خیر کے بعد گوجرانوالہ شہر سے باہر آیئے اور وزیر آباد کا رخ کیجئے' وہاں استاذ پنجاب حضرت مولانا حافظ عبدالمنان محدث کا اسم گرامی سب سے پہلے آئے گا۔ اگرچہ مولد کے اعتبار سے ان کا تعلق وزیر آباد سے نہ تھا' لیکن ان کی علمی و تدریسی زندگی کے لیل و نہار اسی شہر میں بسر ہوئے اور اسی شہر کی نسبت سے انہوں نے شہرت پائی اور تدریسی لحاظ سے خدمت قرآن و حدیث کے جو

کارنامے انہوں نے سرانجام دیئے' بلاشبہ ان میں کوئی ان کا ثانی نہ تھا۔

پھر مولانا فضل الٰہی کا تعلق بھی اسی شہر سے تھا۔ ان کا مجاہدانہ کردار تحریک جہاد حریت کا ایک درخشاں باب ہے' ان کی تمام زندگی سرحد پار کی جماعت مجاہدین میں گزری۔

مولانا احمد الدین گکھڑوی کا مولد و مسکن بھی اسی ضلع کا ایک مقام گکھڑ (Gakhar) تھا' پنجاب میں جن کے وعظوں اور مناظروں کی دھوم تھی۔

صوفی عبداللہ صاحب مرحوم و مغفور (بانی دارالعلوم' اوڈانوالہ و ماموں کانجن) کا تعلق بھی وزیر آباد (ضلع گوجرانوالہ) سے تھا۔ اور یہ بات تو شاید بعض (بلکہ اکثر حضرات کے لیے نئی ہو کہ انہوں نے جب اوڈانوالہ (ضلع لائل پور) میں مدرسے کا آغاز کیا تھا تو اس کے لیے جس مدرس کا تقرر عمل میں لایا گیا' وہ ضلع گوجرانوالہ کے ایک گاؤں کے رہنے والے تھے اور انہیں "مولوی محمد طوطے پکیا" کہا جاتا تھا۔

میں نے ان کو دیکھا ہے وہ پورے قد کے درمیانے سے جسم کے آدمی تھے اور حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی مرحوم کے زمانے میں کچھ عرصہ ان کے مدرسے میں طلباء کو ابتدائی درجوں کی کتابیں پڑھاتے رہے تھے۔

مولانا ظفر علی خان برصغیر کی تحریک آزادی اور تاریخ ادب و صحافت کا ایک نمایاں باب ہیں' ان کا تعلق بھی اسی علاقے کے ایک گاؤں کرم آباد سے تھا۔ وہیں ان کا مدفن ہے۔ حضرات مولانا عبدالمجید سوہدروی سے ان کے بھی بڑے اچھے مراسم تھے۔

ایک مشہور مدرس مولانا فضل الرحمٰن تھے جو اسی شہر کے قریب گوندلانوالہ کے رہنے والے تھے' حال ہی میں ان کا انتقال ہوا۔ پھر حضرت کیلیانوالہ اسی علاقے کا گاؤں ہے جہاں کے متعدد حضرات نے تدریس و تحریر کے رنگ میں کتاب و سنت کی بے حد ترویج کی اور کر رہے ہیں۔ شکر اللہ مساعیھم۔

اس طرح شہر اور ضلع گوجرانوالہ میں بہت سے نامور اہل حدیث علمائے عظام

فروکش تھے اور ان کی مساعی جمیلہ کا سلسلہ بڑا وسیع تھا۔ ان سب کا تذکرہ ان سطور میں نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ ہم اس ضلع کے ایک مشہور قصبے "سوہدرہ" پہنچنا چاہتے ہیں کہ ہمارا اصل مقصد وہاں کے بعض لائق تکریم اصحاب علم و فضل کی صحبت میں چند لمحے گزارنا ہے۔ لیکن وہاں کے جس خاندان کے اہل علم کی خدمت میں ہم عقیدت کے چند پھول پیش کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں' ان سے پہلے وہاں کے مولانا ابو یحیٰی امام خان نوشہروی کا نام لینا ضروری ہے وہ پنجاب کے پہلے اہل قلم ہیں جنہوں نے دہلی میں بیٹھ کر "تراجم علمائے حدیث ہند" کے نام سے کتاب لکھی۔ جس میں دہلی اور یوپی کے اہل حدیث علماء کا تذکرہ سپرد قلم کیا۔ اور وہ کتاب ۱۹۳۸ء میں شائع ہوئی۔ پھر اسی مصنف شہیر نے "ہندوستان میں اہل حدیث کی علمی خدمات" کے نام سے ایک طویل مقالہ لکھا۔ جو آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس کی طرف سے مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی پچاس سالہ جوبلی کے موقع پر ۲۹ / مارچ ۱۹۳۷ء کو (علی گڑھ میں) پڑھا گیا۔ کتاب "تراجم علمائے حدیث ہند" اور یہ مقالہ سوہدرہ کے ایک اہل حدیث مصنف کے اوّلیات کا ایک عظیم الشان حصہ ہے۔ بنیادی طور پر مولانا امام خاں نوشہروی ۔جن کا اصلی نام ملک عبدالغنی تھا) مولانا عبدالمجید سوہدروی کے جد محترم حضرت مولانا غلام النبی عبداللہ الربانی سے فیض یافتہ تھے۔ اور آپ کو آپ کی وصیت کے مطابق مولانا غلام نبی الربانی علیہ الرحمۃ کے قبرستان میں دفن کیا گیا۔

علاوہ ازیں سوہدرہ میں چند ایک اور شخصیتیں ہو گزری ہیں مثلاً : مولوی ابوالمحمود ہدایت اللہ سوہدروی' انہوں نے "اسلام اور عیسائیت" ' "اسلامی اخلاق" ' "شبیرنامہ" ' "تاریخ گگے زئیاں" اور "اسلامی فلسفہ" وغیرہ کتب لکھیں۔

پروفیسر عنایت اللہ نسیم علیگ جو مولانا ظفر علی خاں سے بہت متاثر تھے اور مولانا ظفر علی خاں پر انہوں نے ایک ضخیم کتاب لکھی۔ علاوہ ازیں آپ نے سیرت اور طب پر بھی اچھی کتب تصنیف کیں۔ آج کل ان کے بیٹے حکیم راحت نسیم (جو حضرت مولانا عبدالمجید سوہدروی کے ایک انتہائی عقیدت گزار ملک محمد بشیر سوہدروی

حال کراچی کے داماد بھی ہیں) اپنے والد ماجد حکیم عنایت اللہ نسیم کی تصنیف و تالیف اور علاج معالجے میں جانشینی کر رہے ہیں۔ بڑے شریف الطبع اور مرنجاں مرنج جوان ہیں۔ حکیم عبداللہ خاں نصر علیگ طبیہ کالج کے پروفیسر اور ماہر طبیب تھے۔ بڑے فاضل اور وضع دار تھے آج کل آپ کے بیٹے حکیم ولی الرحمٰن لاہور میں مطب چلا رہے ہیں۔

سوہدرہ کے ایک اور قابل ذکر بزرگ مولوی مراد علی کھوروی بھی تھے' آپ بڑے منجھے ہوئے عالم تھے۔ یہ سب حضرت مولانا عبدالمجید سوہدروی کے علمی خاندان کے فیض یافتہ اور عقیدت مند تھے۔

مولانا عبدالمجید سوہدروی کے تین بیٹے تھے ان کے علاوہ سرزمین سوہدرہ کی اور بھی قابل ذکر شخصیات ہو گزری ہیں۔ مولانا محمد ادریس فاروقی اپنی زیر ترتیب کتاب "تاریخ سوہدرہ" میں ان کا ذکر کریں گے۔ (انشاء اللہ العزیز)

یہاں ایک اور عالم دین کا ذکر بھی ہمارے فرائض میں شامل ہے' ان کے خاندان کے اسلاف کا مسکن بھی کسی زمانے میں سوہدرہ ہی رہا تھا۔ بعد میں یہ حضرات وہاں کی سکونت ترک کر کے وزیر آباد کے قریب ایک گاؤں "ڈھونیکے" چلے گئے تھے۔ یہ عالم دین ہیں حکیم عبدالمجید (مرحوم) جو اس نواح کے مشہور طبیب تھے اور حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی کے چچا زاد بھائی تھے۔ ان کے ایک صاحب زادے ڈاکٹر محمد یوسف فاروق ہیں جن کا وزیر آباد میں بہت بڑا پرائیویٹ ہسپتال بھی ہے۔ حکیم عبدالمجید کا ذکر یہاں اس لیے ذہن میں آیا کہ ان کا منصوبہ ایک ایسے کام کی تکمیل تھا جس میں کوئی مالی منفعت نہ تھی' لیکن وہ اہم کام تھا' حضرت نواب سید محمد صدیق حسن خان رحمہ اللہ کی اردو تفسیر "ترجمان القرآن" کی اشاعت۔ یہ تفسیر پندرہ جلدوں پر مشتمل ہے۔ حکیم صاحب (مرحوم) اس کی ترتیب وغیرہ کرا کے اسے شائع کرنے کا ارادہ رکھتے تھے' لیکن کوشش کے باوجود انہیں کوئی ایسا اہل علم نہ مل سکا جو اس بہت بڑے کام کی تکمیل کر سکے۔ اب حکیم صاحب نے دو صاحب زادے

ڈاکٹر محمد یوسف فاروق اور ان کے بڑے بھائی جناب عتیق الرحمٰن یہ کام کروا رہے ہیں۔ یہ سعادت بھی ان شاء اللہ گوجرانوالہ ہی کے اصحاب علم کو حاصل ہو گی۔ حکیم صاحب نہ ناشر تھے نہ تاجر تھے۔ فقط لوجہ اللہ یہ خدمت انجام دینا چاہتے تھے۔ ان کے صاحب زادوں کا بھی یہی حال ہے۔ حکیم صاحب کے متعلق میرا مضمون میری زیر طبع کتاب "قافلہ حدیث" میں آرہا ہے۔ یہ کتاب مکتبہ قدوسیہ' اردو بازار' لاہور کی طرف سے شائع ہو رہی ہے۔

اب آپ آیئے ضلع گوجرانوالہ کے قصبے سوہدرہ کے اس خاندان کی طرف جس کے تذکرے کے لیے اتنی طویل تمہید باندھی گئی ہے......!

یہ وہاں کا علمی خاندان ہے جو کوئی پشتوں سے علم و عمل' وعظ و تقریر اور تصنیف و تالیف میں خاص امتیاز کا حامل ہے۔ اس خاندان کے ایک بزرگ مولوی محبوب عالم بن حافظ غلام حسین تھے جن کی صالحیت اور نیک نفسی کا اس نواح میں بڑا شہرہ تھا۔ یہ فی الواقع اسم بامسمیٰ بزرگ تھے' یعنی سب کا مرکز محبت۔ بلند اخلاق اور عالی کردار......!!

۴ / ستمبر ۱۸۴۸ء (۲۳ رمضان المبارک ۱۲۶۴ھ) کو اس خوش طینت شخص کو اللہ تعالیٰ نے بیٹا عطا فرمایا جس کا نام انہوں نے غلام نبی رکھا۔ یعنی اللہ کے نبی ﷺ کا غلام' اطاعت شعار اور مطیع و فرماں بردار! بے شک ان کی حیات مستعار کے شب و روز حضور (ﷺ) کی تابعداری اور غلامی میں گزرے۔ تعلیم و تربیت کا مشفق باپ نے خاص طور سے اہتمام کیا۔ ابتدائی درسی کتابیں خود پڑھائیں۔ اس زمانے میں سوہدرہ کے قریب وزیر آباد میں ایک عالم دین مولوی قادر بخش اقامت گزیں تھے' جن کا اس عہد کے مطابق سلسلہ تدریس جاری تھا۔ مولوی محبوب عالم نے بیٹے کو مزید تعلیم کے لیے ان کی خدمت میں بھیج دیا اور ان سے انہوں نے علوم متداولہ کی متعدد کتابیں پڑھیں۔ اور بھی بعض اساتذہ سے کسب علم کیا۔ علوم حدیث کی تکمیل کے لیے حضرت حافظ محمد لکھوی رحمہ اللہ کی خدمت میں حاضری دی۔ لکھو کے ضلع

فیروز پور میں حافظ محمد صاحب مرحوم کا اس عہد میں مشہور مدرسہ تھا۔ جس کے عالی قدر اساتذہ سے بے شمار علماء و طلباء نے استفادہ کیا۔ مولانا غلام نبی (جنہوں نے بعد میں عبداللہ نام اور "الربانی" تخلص اختیار کیا) بھی اپنے عہد شباب میں اس چشمۂ فیض سے سیراب ہوئے۔

انہوں نے دہلی جا کر حضرت مولانا میاں سید نذیر حسین محدث دہلوی سے بھی فیض حاصل کیا اور حضرت سید عبداللہ غزنوی کی خدمت میں امرتسر بھی گئے اور ان سے مستفیض ہوئے۔ یعنی انہوں نے دہلی، لکھو کے اور امرتسر کے تین چشمہ ہائے فیض پر حاضری دی اور ان سے سیراب ہونے کی سعادت سے بہرہ مند ہوئے۔ اس دور میں اہل حدیث کے یہ نہایت مشہور مرکز تدریس تھے۔

تعلیم سے فراغت کے بعد انہوں نے اپنے شہر سوہدرہ میں مسند تدریس آراستہ کی۔ اس کے علاوہ تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی شروع فرمایا۔ اپنے گرد و پیش میں وعظ و تبلیغ کے انداز میں بھی خوب جدوجہد کی۔ بلاشبہ ان کی خدمات کا دائرہ بہت وسعت پذیر تھا اور لوگوں کو اس سے بے حد فائدہ پہنچا۔ سوہدرہ کی بہت بڑی قوم ککے زئی تجارت پیشہ اور خوشحال تھی۔ لیکن یہ شرک و بدعت اور رسومات میں گھری ہوئی تھی ان میں قبر پرستی اور مزاروں کی حاضری کی عام وبا تھی۔ حضرت موصوف کی شبانہ روز کی محنت و کوشش اور دعوت و تبلیغ کے نتیجے میں اللہ کے فضل و کرم سے یہ قوم سیدھے راستے پر آ گئی۔ اور بحمداللہ پوری قوم نے مسلک اہل حدیث اختیار کر لیا۔ ان میں اکیلے ایک شخص نے بہت بڑی "جامع مسجد اہل حدیث ککے زئیاں" سوہدرہ کی بنیاد رکھی۔ اس مسجد کا شمار ضلع گوجرانوالہ کی گنی چنی چند خوبصورت ترین مساجد میں ہوتا ہے۔ مولانا عبدالمجید سوہدروی جب ککے زئی برادری کے اصرار پر اچھرہ لاہور سے سوہدرے منتقل ہوئے تو ایک عرصے تک اس مسجد میں خطبہ جمعہ ارشاد فرماتے رہے۔ آپ مانے ہوئے خطیب تو تھے ہی، آپ نے توحید و سنت اور اصلاح عقائد اور اصلاح رسومات پر ایسی تقریریں کیں کہ آس پاس ہل چل مچ گئی۔

جس کے رد عمل میں آپ کی بہت مخالفت بھی ہوئی مگر آپ کے استقلال اور استقامت نے آپ کی ہر مشکل آسان کر دی۔ جب یہاں کے حالات امید افزاء ہو گئے تو آپ احباب کے مشورہ سے مولانا علم الدین آف واربرٹن کو وہاں متعین کر کے اپنے دادا مرحوم کی مسجد میں تشریف لے آئے اور زندگی بھر یہیں خدمات اسلام فرماتے رہے۔ مولانا علم الدین' شیخ الحدیث حافظ محمد گوندلوی علیہ الرحمۃ کے لائق شاگرد اور صوفی منش عالم تھے۔ علمی پایہ کافی بلند تھا۔ مولانا عبدالمجید سوہدروی نے اپنی آبائی مسجد میں تشریف لے آنے کے بعد بھی ککے زئی برادری سے تعلق استوار رکھا۔ اور برابر چالیس دن تک ان کے محلے میں جا کر قرآن و حدیث کا درس دیتے رہے۔ جس کا بہترین اثر رہا۔

حضرت مولانا غلام نبی الربانی نے تقریباً ۸۳ سال عمر پا کر ۳/ مئی ۱۹۳۰ء (۴۔ ذی الحجہ ۱۳۴۹ھ) کو اپنے وطن سوہدرہ میں وفات پائی۔

مولانا غلام نبی کے دو بیٹے تھے۔ بڑے کا نام عبدالحکیم تھا اور چھوٹے کا عبدالحمید ......! عبدالحکیم ۱۸۷۳ء (۱۲۹۰ھ) کو پیدا ہوئے۔ درس نظامی کی تکمیل اپنے والد محترم مولانا غلام نبی الربانی سے کی اور کتب حدیث حضرت مولانا حافظ عبدالمنان وزیر آبادی سے پڑھیں۔ بہت اچھے واعظ اور بہترین مبلغ تھے۔ عالم جوانی میں ۱۹۰۲ء (۱۳۲۰ھ) کو باپ کی زندگی میں وفات پا گئے۔

عبدالحمید کا سال ولادت ۱۸۸۲ء (۱۳۰۰ھ) ہے۔ انہوں نے ابتدائی کتابیں والد مکرم سے پڑھنے کے بعد حضرت حافظ عبدالمنان وزیر آبادی کے باب فیض پر حاضری دی۔ کتب حدیث کی تکمیل انہی سے کی۔ اور سند سے بہرہ مند ہوئے۔ ان کے تدین اور ذوق علم کی وجہ سے حضرت محدث وزیر آبادی نے اپنی صاحب زادی کا عقد ان سے کر دیا۔ آپ پہلے حضرت حافظ صاحب کے شاگرد تھے پھر داماد بھی بن گئے۔ اور یہ آپ کے لیے بہت بڑی سعادت تھی۔ جو تلامذہ میں سے حضرت مولانا عبدالحمید سوہدروی ہی کے حصے میں آئی۔ حضرت مولانا شمس الحق ڈیانوی (شارح ابوداؤد) سے

بھی زانوئے شاگردی تہ کیا اور ان سے سند حاصل کی۔ مروجہ تعلیم مکمل کرنے کے بعد واپس سوہدرہ آئے تو اپنے نام کی نسبت سے "مدرسہ حمیدیہ" جاری کیا اور درس و تدریس میں مصروف ہو گئے اور بہت سے حضرات نے ان سے استفادہ کیا۔ لیکن بارگاہ خداوندی سے بہت مختصر عمر لے کر آئے تھے' صرف تیس برس.....! ۲۴/ مئی ۱۹۱۲ء (۷ جمادی الاخریٰ ۱۳۳۰ھ) کو اس جہان فانی سے کوچ کر کے عالم آخرت کو روانہ ہو گئے۔ رحمہ اللہ تعالیٰ۔

بوڑھے باپ مولانا غلام نبی الربانی نے عالم بیٹے مولانا عبدالحکیم کی طرح ان کا جنازہ بھی خود پڑھایا اور خود ہی ان کی تجہیز و تکفین کا اہتمام کیا۔ پھر بیٹے کے قائم کردہ مدرسہ حمیدیہ کی تدریس و انتظام کا سلسلہ بھی اپنے ہاتھ میں لیا۔ مولانا عبدالحمید کی وفات سے اٹھارہ سال بعد خود بھی رحلت فرما گئے۔ غفرہ اللہ تعالیٰ۔

ہمارے ممدوح مولانا عبدالمجید سوہدروی انہی مولانا عبدالحمید سوہدروی کے لائق فرزند تھے۔ استاد پنجاب حضرت مولانا حافظ عبدالمنان وزیر آبادی کے جلیل القدر نواسے اور مولانا غلام نبی الربانی کے پوتے......!

مولانا عبدالمجید سوہدروی جنوری ۱۹۰۱ء (۱۳۱۸ھ) کو سوہدرہ میں پیدا ہوئے۔ والد محترم کی وفات کے وقت ان کی عمر صرف گیارہ برس تھی۔ ابتدائی تعلیم اپنے جد محترم مولانا غلام نبی الربانی سے اپنے والد کی قائم کردہ درس گاہ مدرسہ حمیدیہ میں پائی۔ سن و سال میں کچھ اضافہ ہوا تو مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی کی خدمت میں سیالکوٹ بھیج دیئے گئے ان سے درس نظامی کی متداول کتابیں پڑھیں۔ مولانا عبدالمجید چونکہ حضرت حافظ عبدالمنان وزیر آبادی کے نواسے سے تھے اور مولانا سیالکوٹی کو ان کی شاگردی کا شرف حاصل تھا' اس لیے انہوں نے اپنے استاد عالی قدر کے نواسے عبدالمجید کا خاص خیال رکھا اور نہایت شوق اور اہتمام سے ان کو مروجہ کتابیں پڑھائیں۔ خود شاگرد کو بھی حصول علم کا شوق تھا اور وہ محنت اور لگن سے کسب علم کرتے تھے۔ چنانچہ آپ نے تھوڑے ہی عرصے میں علم و فضل کی منزلیں طے کر

لیں۔

مولانا عبدالمجید سوہدروی نے درس نظامی کے علاوہ علم طب بھی پڑھا اور تحریر و تقریر میں بھی آگے بڑھنے کی کوشش کی اور اس کوشش میں اللہ نے انہیں بہت کامیابی سے نوازا۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد انہوں نے سوہدرہ میں تدریس کا سلسلہ بھی شروع کیا لیکن بوجہ تبلیغی مصروف اسے جاری نہ رکھ سکے۔ وعظ و تقریر کو ذریعۂ خدمت اسلام قرار دیا۔ "طبی کارخانہ" سوہدرہ کے نام سے ادارہ اور مطب قائم کیا۔ جس کے ذریعے ملک و قوم کی بڑی خدمت کی۔ آپ نے تحریر و نگارش کے میدان میں خود اعتمادی سے قدم رکھا۔ خدمت دین کے جو چار شعبے تھے مولانا عبدالمجید سوہدروی ان چاروں میں درک رکھتے تھے۔ ذہین' مستعد اور تیز رو عالم دین تھے۔ انہوں نے مختلف مذہبی' تاریخی' سوانحی اور طبی موضوعات سے متعلق کتابیں بھی لکھیں اور تین رسائل و اخبارات بھی جاری کیے۔ تقریر و خطابت میں ان کو اللہ تعالیٰ نے ایسا ملکہ عطا فرمایا تھا کہ پورے ملک میں ان کی مانگ تھی۔ وہ اگرچہ مسلکاً اہل حدیث تھے' لیکن احناف کے جلسوں میں بھی انہیں دعوت دی جاتی تھی اور وہ ان کے جلسوں میں بھی تقریریں کرتے تھے۔ سلیس و عام فہم زبان اور صاف انداز و اسلوب میں اظہار خیال فرماتے تھے۔ اور اپنی بات پورے اعتماد کے ساتھ دبنگ لہجے میں سامعین تک پہنچاتے تھے۔ مناظرہ خاص فن ہے' اس میں بھی وہ دسترس رکھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں گفتگو اور حالات کو کنٹرول کرنے کا بہترین سلیقہ عطا فرمایا تھا۔

انہوں نے قرآن' حدیث' روزہ مرہ پیش آنے والے فقہی مسائل' سیرت' تاریخ' ادب' رد قادیانیت' سیاست' طب وغیرہ موضوعات پر بڑی اچھی کتابیں تصنیف کیں۔ کسی موقع پر کوئی کتاب مختصر لکھی' کوئی مفصل۔ حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسری کے حالات پر مشتمل مفصل کتاب "سیرت ثنائی" لکھی۔ جو اس موضوع کی پہلی کتاب ہے۔ اس کتاب میں مولانا امرتسری کی زندگی کے تمام واقعات بڑی

خوبصورتی سے جمع کر دیئے گئے ہیں۔ ان کی تمام تصنیفات خاص اہمیت کی حامل ہیں۔ جن کی تعداد ۵۰/۶۰ کے قریب بیان کی جاتی ہے۔ آپ کی زیادہ کتب طب پر ہیں۔ اسلامی کتب میں تفسیر سورۂ فاتحہ' نبی ﷺ کی سیرت مبارک پر رہبر کامل' علاوہ ازیں دولت مند صحابہؓ' سیرت عائشہؓ' سیرت فاطمہؓ' سیرۃ الائمہ' حالات حضرت امام ابو حنیفہ' سوانح استاد پنجاب حافظ عبدالمنان وزیر آبادی' تحریک وہابیت' ہندو شعراء کا نعتیہ کلام' انتخاب صحیحین (یعنی صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی احادیث کا انتخاب) انگریز اور وہابی وغیرہ کتابیں شامل ہیں۔

پھر انہوں نے بعض دوسرے مشہور مصنفین کی بھی بعض نہایت اہم کتابیں شائع کیں' مثلاً علامہ قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری کی "رحمۃ للعالمین" کی تیسری جلد شائع کی' قاضی صاحب کی تاریخ المشاہیر اور ان کے خطبات اور مکتوبات بھی شائع کیے۔

کسی زمانے میں مولانا عبدالمجید سوہدروی انجمن اہل حدیث پنجاب کے ناظم اعلیٰ بھی رہے' جب کہ حضرت قاضی محمد سلیمان منصور پوری اس کے صدر تھے۔ ان دونوں بزرگوں میں علمی و روحانی گہرے روابط تھے۔ قاضی صاحب مرحوم ایک مرتبہ سوہدرے بھی تشریف لے گئے۔

مولانا سوہدروی کی ایک کتاب کا نام "نقوش ابوالکلام و مقالات آزاد" ہے جو امام الہند حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کے واقعات و حالات پر محیط ہے۔ اس وقت آپ کے اوصاف و کمالات سے متعلق بہت سے اخبارات و جرائد نے بہت کچھ لکھا اور بالکل صحیح لکھا۔ اس بات میں ذرا بھی مبالغہ نہیں کہ حضرت مولانا ابوالکلام آزاد منبع علم و ادب اور معدن فضل و کمال تھے۔ گوناگوں محاسن ان کی ذات گرامی میں سمٹ آئے تھے۔ مولانا عبدالمجید سوہدروی ان سے والہانہ عقیدت رکھتے تھے اور بلاشبہ وہ اس لائق تھے کہ ان سے عقیدت رکھی جائے اور اس کا اظہار کیا جائے۔

مولانا سوہدروی کا اس زمانے میں "جریدہ اہل حدیث" شائع ہوتا تھا۔ انہوں

نے اس اخبار کا "آزاد نمبر" شائع کرنے کا اعلان کیا اور ستمبر ۱۹۵۹ء میں یہ نمبر شائع کر دیا جو ایک ضخیم نمبر تھا اور مولانا آزاد سے متعلق نہایت عمدہ مضامین کا ایک شاندار مجموعہ تھا' جس میں ان کی ولادت' حسب نسب' تحصیل علم' ذہانت' خطابت' تحریر و نگارش' اتباع کتاب و سنت' تفسیر' حدیث' سیاست' تحریک آزادی کے لیے جدوجہد' قید و بند' اعلائے کلمۃ اللہ کا جذبہ صادقہ' استقلال و استقامت وغیرہ تمام اوصاف و کمالات جمع کر دیے گئے ہیں۔ مولانا ابوالکلام کے متعلق اس نمبر کو انسائیکلوپیڈیا کی حیثیت حاصل ہے۔ اور کمال یہ ہے کہ اس نمبر میں مندرج یہ تمام مضامین خود مولانا عبدالمجید سوہدروی کے رقم فرمودہ ہیں۔ یہ نمبر بعد میں "سیرت آزاد" کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہوا۔ مولانا آزاد کی وفات سے ایک سال سات مہینے کے بعد ستمبر ۱۹۵۹ء کو یہ نمبر معرض اشاعت میں آیا تھا۔ اور پھر اس کی اشاعت سے دو مہینے بعد ۱۶/ نومبر ۱۹۵۹ء کو اس نمبر کے شائع کرنے والے مولانا عبدالمجید سوہدروی بھی وہیں پہنچ گئے' جہاں مولانا ابوالکلام آزاد پہنچے تھے۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ ان دونوں بزرگوں کی مغفرت فرمائے۔ آمین یا رب العالمین!

سیرت آزاد جو "جریدہ اہل حدیث" کے مندرجات پر مشتمل تھی' تھوڑے عرصے میں ختم ہو گئی تھی۔ اب یہ کتاب ادارہ مسلم پبلی کیشنز سوہدرہ کی طرف سے شائع کی گئی ہے۔ ادارہ مسلم پبلی کیشنز سوہدرہ جس کی شاخ لاہور میں بھی ہے مولانا عبدالمجید سوہدروی کے سبط الرشید یعنی حقیقی پوتے مولانا محمد ادریس فاروقی کا قائم کردہ ہے۔ اس ادارہ کے تحت متعدد کتب شائع ہو چکی ہیں۔ "نقوش ابوالکلام" کا ڈسٹری بیوٹر ادارہ دارالسلام لاہور ہے۔ یہ ادارہ ایک عرصے سے اشاعتی رنگ میں خدمت اسلام میں مصروف ہے' اس کا مرکزی دفتر الریاض سعودی عرب میں ہے۔ لیکن پوری دنیا میں اس کی شاخیں موجود ہیں۔ اس کے منتظم مولانا عبدالمالک مجاہد ہیں۔ یہ مکتبہ عربی' اردو' انگریزی فرنچ' ہسپانوی' فارسی' پشتو' ہندی اب تک بے شمار کتابیں شائع کر چکا ہے' جو قرآن' حدیث' تاریخ' عقائد اور روزانہ پیش آنے والے

مسائل پر مشتمل ہیں۔ تصنیف و تالیف اور تراجم کے لیے اس مکتبے کو متعدد اہل علم کی ہمہ وقتی اور جز وقتی خدمات حاصل ہیں۔

مسلم پبلی کیشنز سوہدرہ کی مطبوعات میں "سیرت آزاد" ایک اہم اضافہ ہے۔ ہم اس کی اشاعت پر مکتبہ کے کارپردازوں کو بھی ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہیں اور کتاب کے مصنف نام دار کے پوتے مولانا حکیم محمد ادریس فاروقی کو بھی بہ صمیم قلب مبارک باد دیتے ہیں' جن کی کوشش سے یہ اہم کتاب شائع ہوئی ہے۔ اس بات کی بے حد خوشی ہے کہ آپ کی خاندانی مسند کے جانشین مولانا حکیم محمد ادریس فاروقی مولانا مرحوم کی دوسری کتابوں کی اشاعت کا بھی اہتمام کر رہے ہیں۔ آپ نے حال ہی میں مولانا سوہدروی مرحوم کی سیرت النبی ﷺ پر بہترین کتاب "رہبر کامل" بڑی عمدہ اور معیاری چھپوائی ہے۔ آپ مرحوم کے فتاویٰ بھی مرتب کر چکے ہیں جو عنقریب زیور طبع سے آراستہ ہو کر مارکیٹ میں آ جائیں گے۔ ان شاء اللہ۔ بیشک یہ فتاویٰ علمی شاہکار ہو گا اس میں حضرت مولانا عبدالمجید سوہدروی اور ان کے بڑے صاحبزادے (یعنی مولانا محمد ادریس فاروقی کے والد ماجد) مولانا حافظ محمد یوسف علیہ الرحمۃ کے فتاویٰ بھی ہیں۔ حافظ محمد یوسف صاحب کا علمی و روحانی پایہ بھی کافی اونچا تھا۔ آپ قرآن و حدیث اور تفسیر قرآن کے حافظ تھے۔ آپ سے سوہدرہ/ تلواڑہ بہت مستفید ہوا۔ ہر فرقہ آپ کا مداح ہے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ادارہ مسلم پبلی کیشنز سوہدرہ کو دن دگنی رات چوگنی ترقی عطا فرمائے۔ آمین۔

محمد اسحاق بھٹی

اسلامیہ کالونی۔ سانده۔ لاہور۔

۱۱۔ جون ۲۰۰۱ء / ۱۸ ربیع الاول ۱۴۲۲ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش گفتار

مولانا ابوالکلام آزاد کی ذات گرامی محتاج تعارف نہیں۔ آپ ایک منفرد اور متنوع حیثیت کے حامل تھے۔ آپ علوم اسلامیہ کے بحر ذخار تھے۔ اگر آپ نے تصانیف چھوڑیں' تو اس قدر عمیق کہ علوم اسلامی اور تاریخ و ادب کے غواص ان میں غوطہ زنی کر کے حقائق و معارف کے موتی نکالتے رہیں گے۔ اور بازار علم و ادب کی رونق بڑھاتے رہیں گے۔

مولانا ابوالکلام آزاد علیہ الرحمۃ اپنے علمی تبحر اور بیکراں علم و فضل کے ساتھ ساتھ ایک جامع کمالات شخصیت کے حامل تھے۔ وہ بیک وقت مفسر قرآن بھی تھے اور محدث بھی۔ مؤرخ بھی تھے اور محقق بھی۔ متکلم بھی تھے اور فلسفی بھی۔ فقیہ بھی تھے اور معلم بھی۔ ادیب بھی تھے اور شاعر بھی۔ نقاد بھی تھے اور دانشور بھی۔ سیاستدان بھی تھے اور مبصر بھی۔ غرض ان کے رہوار قلم کی جولانیوں سے کوئی میدان بھی محروم نہیں رہا۔ ادب و تنقید کا میدان ہو یا تاریخ و سیر کا' قرآن مجید کی تفسیر ہو یا حدیث نبوی کی تشریح و توضیح' سیاسی موضوعات ہوں یا دقیق علمی مباحث' ہر موضوع پر ہر وقت ان کا اشہب قلم یکساں جولانی دکھاتا تھا۔ اور ان سب تخلیقات کے پس منظر میں مولانا ابوالکلام آزاد علیہ الرحمۃ کی رنگا رنگ شخصیت قوس و قزح کی طرح نمایاں دکھائی دیتی ہے۔ ان میں اعتدال و توازن بدرجہ اتم موجود تھا۔ خود آرائی و خود ستائی سے نفرت' انکسار' تواضع' سادگی' خاکساری' حق گوئی' عالی ظرفی'

ثابت قدمی' خوش طبعی' شگفتہ مزاجی' فکری بلندی' کثرت مطالعہ' ذوق تحقیق اور فکر جستجو' مولانا آزاد کی سیرت و کردار کے نمایاں جوہر تھے۔ ان کے عکس ضوبار سے ان کی کوئی تصنیف خالی نہیں ہے۔

ترجمان القرآن ہو یا تذکرہ' غبار خاطر ہو یا کاروان خیال' قول فیصل ہو یا افسانہ ہجر و وصال' نقش آزاد ہو یا تبرکات آزاد' ابوالکلام کی منفرد و جامع شخصیت کے نقوش ہر جگہ پرتو فگن ملیں گے۔

حق تعالیٰ نے آزادؒ کے پیکر محدود میں لا محدود حسن بھر دیا۔ جس میں فرق تا بہ قدم پوری تابانیوں اور درخشانیوں کے ساتھ حسن جلوہ بار دکھائی دیتا ہے۔ دماغ طاقتور' نگاہ جسور و غیور' زبان ادب کا شاہکار' قلم گوہر بار' خلق پھولوں کا گلدستہ' قلب مجلی و مزکی' فکر سدرہ آشنا' ذوق میں نکھار' مزاج میں استغناء' سراپائے تمکنت و وقار' علم و حلم کا جامع' صابر و قانع' جلال و جمال کا پیکر---- قدرت نے خاور کی روپہلی کرنوں میں سات رنگ بھر کر انہیں حسین بنایا' مگر اس عبقری میں کئی رنگ بھر کر دلربا بنا دیا۔ ایسا دلربا جو عقیدت کیشان علم و ارادتمندان ادب کے دل میں یوں سمایا ہوا ہے جیسے صدف میں موتی یا گل تر میں قطرۂ شبنم۔

ابوالکلام آزاد سے ہر وہ شخص عقیدت رکھتا ہے جو شجاعت' بسالت' حق گوئی' مروت' غیرت' خود داری' علو ہمتی' امامت' صداقت' امانت' دیانت' انابت' اطاعت' لطافت' اخلاص' وفا' عطاء' سوز' تڑپ اور عشق ایسے اوصاف جمیلہ سے محبت رکھتا ہے۔ یہاں عشق سے مراد سچی تڑپ اور جذبہ صادق ہے۔ آزاد کے دل میں آزادی کی تڑپ تھی۔ وہ برصغیر کو انگریز کی غلامی سے آزاد دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کا کہنا تھا پہلے بیرونی دشمن (انگریز) سے پیچھا چھڑا لو پھر اپنا اندرونی معاملہ خود حل کر لیں گے۔ ہو سکتا ہے ان کی پالیسی سے کسی کو اختلاف ہو لیکن ان کی نیت پر شبہ کرنا کم از کم تعلیم یافتہ اور انصاف پسند احباب کو زیب نہیں دیتا۔

اس میں شبہ نہیں کہ وہ پہلے روز سے آخر تک کانگریس میں رہے۔ اور تقسیم

ملک کے حق میں نہ تھے۔ دراصل ان کا خیال تھا کہ الگ ملک بنانے سے مطلوبہ مقاصد پورے نہیں ہو سکتے' مقاصد کا پورا ہونا تو رہا ایک طرف' برصغیر کو تقسیم کرنے سے مجموعی طور پر اتنا بھیانک اور اتنا زیادہ نقصان ہو گا جس کا فی الحال تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اور تقسیم ملک پر املاک و نفوس کا جو نقصان ہوا سب کی آنکھوں نے اس کا مشاہدہ کر لیا۔ ان کا خیال تھا کہ ایک ہی ملک میں ایک ساتھ رہ کر زیادہ مقاصد بروئے کار لائے جا سکتے ہیں۔ لیکن جب پاکستان وجود میں آ گیا تو پھر آپ نے مخالفت ترک کر دی۔ اس سلسلے میں شیخ محمد اشرف مرحوم کا بیان پڑھنے کے قابل ہے۔ اس میں ایسے اعتراضات کا جواب موجود ہے۔ بہت سے لوگ نا سمجھی یا تعصب کی بنا پر مولانا کو ہندو نواز اور ہندو دھرم کا پرچارک کہہ کر اپنے دل کی بھڑاس نکالتے ہیں اور اپنی آتش حسد و انتقام کو فرو کرنے کے لئے ناروا بول بولتے اور اوچھا لہجہ اختیار کرتے ہیں۔ سب لوگ جانتے ہیں چاند پر تھوکنے سے چاند کا کچھ نہیں بگڑتا الٹا تھوک منہ پر گرتی ہے۔ اس طرح معترضین و حاسدین اپنی ردائے عزت کو خود اپنے پاؤں تلے روندتے ہیں۔ اس سے آزاد کا کیا بگڑتا ہے؟ ناروا اعتراضات کرنے اور دل میں بغض پالنے والے احباب کو اپنے طرز عمل پر غور کرنا چاہیے۔ اور دل صاف کر لیں تو کوئی بڑی بات نہیں ہے۔

مولانا آزاد کی فکر اور سیاسی بصیرت منفرد تھی' اس سے ہر ایک کو اختلاف کا حق ہے' لیکن یہ کسی صورت مناسب نہیں کہ ان کی لیاقت و حذاقت' علمیت و قابلیت ذہانت و فطانت اور ملی و قومی خدمت کا انکار کر دیا جائے۔ محض انکار ہی نہ کیا جائے بلکہ اسے بگاڑ کر پیش کیا جائے۔ ان کی علمی استعداد' فکری پرواز' نور بصیرت' ژرف نگاہی' وسیع النظری اور ادبی ارتقاء کا تو کوئی دشمن بھی انکار نہیں کر سکتا۔ ایسے ہی وحید العصر اور نادرۂ روزگار ہستیوں کے بارے میں کہا گیا ہے ؎

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

مولانا ابو الکلام آزاد نے ۲۲ / فروری ۱۹۵۸ء بعمر ۷۰ برس رحلت فرمائی۔ ان کے انتقال پر برصغیر (پاک و ہند) کے اخبارات و رسائل نے اداریے اور شذرات لکھے۔ اور بعد میں ان کی یاد میں خصوصی نمبر شائع کیے۔ (ملک عبدالرشید صاحب عراقی نے اپنے مضمون "تعارف" میں بعض اخبارات و رسائل کے خصوصی نمبروں کی فہرست دی ہے)

جد محترم حضرت مولانا عبدالمجید سوہدروی علیہ الرحمۃ کو مولانا ابوالکلام آزاد سے خصوصی تعلق تھا۔ ایک دو دفعہ ان سے ملاقات بھی ہوئی تھی۔ موصوف کے انتقال کے بعد حضرت مولانا سوہدروی علیہ الرحمۃ نے ستمبر ۱۹۵۹ء میں "جریدہ اہل حدیث سوہدرہ" کا آزاد نمبر جو بڑے سائز کے چوالیس ۴۴ صفحات پر مشتمل تھا شائع کیا۔ یہ نمبر ملک کے دوسرے اخبارات و رسائل کے مقابلہ میں منفرد حیثیت کا حامل ہے۔ اس کا اندازہ آپ فہرست کے عنوانات پر ایک نظر ڈالنے سے لگا سکتے ہیں۔ اس کی افادیت اور اہمیت آج ۴۲ سال گزرنے کے بعد بھی اسی طرح ہے جو اس کے شائع ہونے پر ۱۹۵۹ء میں تھی۔ تقریباً نصف صدی گزرنے کے بعد اب بھی اس کی مانگ اسی طرح ہے جس طرح پہلے تھی۔ پھر ہم نے اس کی ترتیب و تبویب اور تزئین کر کے ۱۹۸۴ء میں شائع کیا۔ یہ اس کا دوسرا ایڈیشن تھا۔ اب مئی ۲۰۰۱ء میں معمولی حک و اضافہ کے ساتھ اس کا تیسرا ایڈیشن شائع ہوا ہے۔ احباب کے تقاضوں کے پیش نظر اسے گزشتہ ماہ مئی ۲۰۰۱ء میں کتابی سائز میں شائع کیا گیا۔

ادارہ مسلم پبلی کیشنز لاہور / سوہدرہ قارئین کی دعاؤں سے بحمد للہ ایک بڑھتا چڑھتا اور ابھرتا ہوا ادارہ ہے۔ اس ادارہ کی علمی ادبی' اسلامی' تاریخی' سوانحی بیسیوں کتب ہیں' جن کی بدولت ادارہ ملی و قومی خدمت سرانجام دے رہا ہے۔ اب حال ہی میں اپنی مطبوعات کو پھیلانے کی غرض سے ادارہ دارالسلام لاہور کو اپنا ڈسٹری بیوٹر بنایا ہے۔ جس کے سبب سے امید ہے ہمیں اپنا لٹریچر ملکی سطح پر ہی نہیں عالمی سطح پر پھیلانے کا موقع ملے گا۔ وما ذالک علی اللّٰہ بعزیز

نقوش ابوالکلام کا تعارف ملک عبدالرشید عراقی صاحب نے لکھا ہے اور مقدمہ میدان تاریخ و سیر کے کہنہ مشق ادیب جناب محمد اسحاق بھٹی حفظہ اللہ نے تحریر کیا ہے۔

امید ہے "نقوش ابوالکلام" قوم و ملت کے لیے بیش از بیش مفید ثابت ہوگی۔ انشاء اللہ۔

محمد ادریس فاروقی
سوہدرہ۔ ضلع گوجرانوالہ
جولائی ۲۰۰۱ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تعارف

۱۸۷۱ء تا ۱۹۰۰ء کا زمانہ علمی و ادبی' تاریخی و سیاسی اعتبار سے برصغیر (پاک و ہند) کی تاریخ کا عہد زریں قرار دیا جا سکتا ہے۔ بلاشبہ اس ۳۰ سال کی مختصر مدت میں آسمان علم و ادب' مہ و انجم سے جگمگا اٹھا' علامہ اقبال' محمد علی جناح' محمد علی' شوکت علی' ظفر علی خان' حسرت موہانی' عبدالماجد دریا آبادی' سید سلیمان ندوی' مولانا ثناء اللہ امرتسری' مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی' اور مولانا ابو الکلام آزاد۔ سب اسی عہد روشن کے آفتاب و ماہتاب تھے' مولانا آزاد کو اس علمی کہکشاں میں کوکب تاباں کی حیثیت حاصل ہے۔ جامعیت اور علمی تبحر میں ان کی ہمہ گیری کی نظیر معاصرین میں کم یاب ہے۔ مولانا آزاد کا اہم ترین کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اردو زبان کو جلا بخشی' اور اردو زبان کو مذہب و تاریخ کا سرمایہ دار بنایا۔ اور تحقیق و تنقید کو گلے لگا کر علمی و تحقیقی' مذہبی و ذہنی' تاریخی و تنقیدی میدان میں اپنا منفرد نام پیدا کیا۔

مولانا ابوالکلام آزاد علم و فضل کے اعتبار سے بے نظیر اور عدیم المثال تھے۔ وہ فطری طور پر عبقری تھے۔ فلسفیانہ فکر اور مجتہدانہ دماغ رکھتے تھے۔ حکیم و مفکر بھی تھے۔ امام اور مجتہد بھی تھے۔ میدان سیاست کے مدبر بھی تھے۔ سحر طراز ادیب بھی تھے۔ جادو بیان خطیب بھی تھے۔ دیدہ وری' اور نکتہ رسی میں ان کا کوئی حریف نہ تھا' ذہانت و ذکاوت' فہم و فراست اور اصابت رائے میں ان کی مثال نہیں ملتی۔ حق و صداقت اور عزم و استقلال کے پہاڑ تھے۔ وہ جنگ آزادی کے میر کارواں اور

ہندوستان کے معمار اعظم تھے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی تمام علوم اسلامیہ پر وسیع نظر تھی۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں قوت حافظہ کی غیر معمولی نعمت سے نوازا تھا۔ جو کتاب ایک دفعہ نظر سے گزر گئی' اس کو زندگی بھر دوبارہ دیکھنے کی نوبت نہیں آئی۔ عربی اور فارسی کی بڑی بڑی دقیق علمی اور ضخیم کتب ان کے مطالعہ میں آئی تھیں۔ عربی و فارسی ادب سے بے حد لگاؤ تھا۔ تفسیر قرآن میں ان کا کوئی حریف نہیں تھا۔ ترجمان القرآن میں آپ نے جو علمی و تحقیقی اور تاریخی نکات بیان کیے ہیں اس سے آپ کے علمی تبحر' کثرت مطالعہ اور ذوق تحقیق کا اندازہ ہوتا ہے۔

مولانا ظفر علی خان نے اسی لیے فرمایا تھا ؂

جہان اجتہاد میں سلف کی راہ گم ہو گئی
ہے تجھ کو اس میں جستجو تو پوچھ ابوالکلام سے

نثر و نظم میں بھی ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ ۱۳ سال کی عمر میں فارسی اور اردو میں شعر کہے۔ اور نثر میں ایسے ایسے الفاظ کہے جن سے اس وقت کے سحر طراز ادیب بھی ناآشنا تھے۔ اور ان کی نثری عبارتیں دیکھ کر حسرت موہانی کو یہ کہنا پڑا ؂

جب سے دیکھی ابوالکلام کی نثر
نظم حسرت میں کچھ مزا نہ رہا

مولانا ابوالکلام آزاد بلند پایہ صحافی بھی تھے۔ ۱۱ سال کی عمر میں صحافت سے وابستہ ہوئے۔ ۱۸۹۹ء تا ۱۹۲۷ء یعنی ۲۸ سال تک آپ صحافت سے منسلک رہے۔ ۱۳ / جولائی ۱۹۱۲ء کو آپ نے کلکتہ سے ہفتہ وار "الہلال" جاری کیا۔ الہلال مختلف حیثیتوں سے اردو صحافت میں ایک نیا باب تھا۔ وہ صحیح معنوں میں ہماری سیاسی صحافتی اور ادبی تاریخ میں سنگ میل ثابت ہوا۔ الہلال عصری صحافت میں محض ایک اور اخبار کا اضافہ نہ تھا بلکہ درحقیقت وہ اپنی ذات میں ایک مستقل تحریک تھا۔ جس نے طوفان حوادث میں اسلامیان عالم اور بالخصوص ہندوستانی مسلمانوں کی ہچکولے کھاتی

ہوئی کشتی کے لئے ناخدائی کا فریضہ انجام دیا۔

الہلال محض ایک اخبار نہیں دراصل ایک صور قیامت تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے الہلال کے ذریعہ کلمہ حق بلند کیا۔ اور جرأت حق گوئی و راست بازی کی وہ روشن مثال قائم کی جس کی مثال ہماری صحافت میں مشکل ہی سے ملے گی۔ انہوں نے قرآن کی معرفت اور تفسیری ترجمہ سے اسلام کی سچی تعلیم کے احیاء کی کوشش کی۔ جس میں سب سے زیادہ زور راست گفتاری اور آزادی کے لئے لڑنے پر ہے۔

الہلال کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ اس نے ہندوستانی مسلمانوں کے معتقدات میں ایک عظیم انقلاب برپا کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔

مولانا ابوالکلام آزاد شروع ہی سے کانگرس سے وابستہ ہوئے۔ اور آخر عمر تک کانگرس سے وابستہ رہے۔ لیکن کانگرس میں رہ کر وہ مسلمان ہی نہ تھے اسلام کے سچے شیدائی اور مسلمانوں کے ہمدرد و خیر خواہ تھے۔ وہ کانگرس کے صدر بھی رہے لیکن ان کے سیاسی و مذہبی افکار میں تبدیلی نہیں آئی۔

۱۹۴۰ء میں کانگرس کے اجلاس رام گڑھ میں آپ نے جو خطبہ صدارت ارشاد فرمایا اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ مولانا آزاد کے سیاسی اور مذہبی افکار کیا تھے۔ مولانا نے اپنے خطبہ میں فرمایا:

"میں مسلمان ہوں اور فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ مسلمان ہوں۔ اسلام کی ۱۳ سو برس کی شاندار روایات میرے ورثے میں آئی ہیں۔ میں تیار نہیں کہ اس کا چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی ضائع ہونے دوں۔ اسلام کی تعلیم' اسلام کی تاریخ' اسلام کے علوم و فنون' اسلام کی تہذیب' میری دولت کا سرمایہ ہے۔ اور میرا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کروں۔ بحیثیت مسلمان ہونے کے میں مذہبی اور کلچرل دائرے میں اپنی ایک خاص ہستی رکھتا ہوں۔ اور میں برداشت نہیں کر سکتا کہ اس میں کوئی مداخلت کرے۔ لیکن ان تمام احساسات کے ساتھ میں ایک اور احساس بھی رکھتا ہوں جسے

میری زندگی کی حقیقتوں نے پیدا کیا ہے۔ اسلام کی روح مجھے اس سے نہیں روکتی۔ وہ اس راہ میں میری رہنمائی کرتی ہے۔ میں فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں ہندوستانی ہوں۔ میں ہندوستان کی ناقابل تقسیم متحدہ قومیت کا ایک عنصر ہوں۔ میں اس متحدہ قومیت کا ایک حصہ ہوں جس کے بغیر اس کی عظمت کا ہیکل ادھورا رہ جاتا ہے۔ میں اس کی تکوین (بناوٹ) کا ایک ناگزیر عامل (Factor) ہوں میں اپنے اس دعوے سے کبھی دستبردار نہیں ہو سکتا"۔

(خطبات آزاد ص ۲۹۷ مطبوعہ دہلی ۱۹۷۴ء)

مولانا ابوالکلام آزاد برصغیر کی تقسیم کے مخالف تھے اور انہوں نے قائداعظم محمد علی جناح کے دو قومی نظریہ سے اختلاف کیا تھا۔ لیکن یہ حقیقت ہے جب پاکستان کا قیام عمل میں آگیا۔ تو انہوں نے مخالفت ترک کر دی۔ اور اس وقت ان کا یہ نظریہ ہو گیا کہ پاکستان قائم ہو گیا ہے۔ اب اس کو مضبوط بنانے کی ضرورت ہے۔

ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہان پوری اپنے ایک مقالہ میں لکھتے ہیں کہ :

"قیام پاکستان کے بارے میں ان کی رائے ڈھکی چھپی نہیں وہ اس کے قیام کے سخت مخالف تھے۔ وہ پاکستان کی اسکیم کو ہندوستان کے کل 9 کروڑ مسلمانوں کے مسئلے کا صحیح حل نہیں سمجھتے تھے۔ لیکن جب ملکی اور کل قومی سطح پر سب کا اتفاق ہو گیا اور قرار پایا کہ ملک کی تقسیم ہو گی تو پھر انہوں نے مخالفت ترک کر دی۔ پھر اگر کبھی تذکرہ آیا بھی تو تاریخ کے واقعے اور اس سے اپنے عدم اتفاق اور اپنی رائے کی صحت پر بعد کے التفات سے استدلال کا آیا۔ انہوں نے کبھی پاکستان کو ختم ہو جانے سے اسے کمزور کرنے، اس کی ترقی میں رکاوٹ پیدا کرنے اس کے انتشار کو بڑھانے کی خواہش نہیں کی۔ بلکہ اس کے استحکام، اس میں جمہوریت کے فروغ، اس کے مختلف طبقوں اور فرقوں میں مفاہمت اور ہندوستان سے

اس کے خوشگوار تعلقات کے نہ صرف آرزو مند رہے بلکہ اس کے لئے انہوں نے بہترین کوششیں بھی کیں"۔ (آثار و نقوش ص ۲۹)

مولانا ابوالکلام آزاد نے ۲۲/ فروری ۱۹۵۸ء / ۱۳۷۷ دہلی میں انتقال کیا۔ عمر ۷۰ سال تھی۔ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلَهُ وَارْحَمْهُ وَ اَدْخِلْهُ جَنَّةَ الْفِرْدَوْس۔

مولانا ابوالکلام آزادؒ کے انتقال پر برصغیر (پاک و ہند) کے تمام اخبارات و رسائل نے رنج و غم کا اظہار کیا اور ان پر اداریے اور شذرات لکھے۔ اور بعد میں "خصوصی نمبر" شائع کیے۔

روزنامہ الجمعیۃ دہلی نے "ابوالکلام آزاد نمبر" شائع کیا۔ علاوہ ازیں اس کے ماہنامہ "آج کل" دہلی، ماہنامہ "ادیب" علی گڑھ، سہ روزہ "دعوت" دہلی۔ ماہنامہ "صبح" دہلی نے "ابوالکلام آزاد" نمبر شائع کیے۔ ان رسائل میں مولانا آزاد کی علمی و ادبی اور سیاسی خدمات کا تفصیل سے تذکرہ کیا گیا ہے۔ ماہنامہ "معارف" اعظم گڑھ، ماہنامہ "برہان" دہلی، ماہنامہ "جامعہ" دہلی، "مدینہ" بجنور، ماہنامہ "زندگی" رام پور، ماہنامہ "سب رس" حیدرآباد دکن، ماہنامہ "ہماری زبان" علی گڑھ، ماہنامہ "الفرقان" لکھنو ماہنامہ "دارالعلوم" دیوبند۔ اور ہفتہ وار "صدق جدید" لکھنو نے مولانا مرحوم کے بارے میں مضامین شائع کیے۔

پاکستان میں ماہنامہ "فاران" کراچی، ماہنامہ "ترجمان القرآن" لاہور، ماہنامہ "رحیق" لاہور، ہفت روزہ "الاعتصام" لاہور، سہ روزہ "منہاج" لاہور، ہفت روزہ "چٹان" لاہور، وغیرہ نے مولانا ابوالکلام آزاد کے بارے میں بہترین اور قیمتی مضامین و مقالات شائع کیے۔ اور ان کی علمی و دینی اور سیاسی خدمات کا کھلے لفظوں میں اعتراف کیا۔

ہفت روزہ "جریدہ اہلحدیث سوہدرہ" نے ستمبر ۱۹۵۹ء میں "مولانا ابوالکلام آزاد کی یاد میں" "سیرت آزاد" کے نام سے خصوصی نمبر شائع کیا۔ یہ نمبر بیشتر رسائل و جرائد کے مقابلہ میں منفرد حیثیت کا حامل ہے۔ ملک و ملت کے مایہ ناز عالم

اور ممتاز ادیب و خطیب حضرت مولانا عبدالمجید سوہدروی مرحوم ایڈیٹر جریدۂ اہل حدیث نے لکھا ہے:

"کہ میرے مطالعہ میں مولانا آزاد مرحوم پر جو نمبر شائع ہوتے آئے ہیں۔ اس میں سے کسی نے بھی یہ ضروری نہیں سمجھا کہ ان کے مسلک کی نشاندہی کی جائے۔ معلوم نہیں کہ ان رسائل و جرائد نے اس طرف کیوں توجہ نہیں کی؟ میں نے اس نمبر میں واضح کیا ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد تقلید و جمود سے نفور اور مسلک اہل حدیث کے حامل تھے"۔

اس نمبر میں اختصار اور جامعیت کے ساتھ مولانا آزاد کی زندگی کا پورا احاطہ کیا گیا ہے۔ ان کی دینی، علمی، مذہبی، قومی و ملی اور سیاسی خدمات کا تذکرہ کیا گیا ہے اور مولانا کی زندگی کا کوئی ایسا گوشہ نہیں چھوڑا جس پر مختصراً یا تفصیل سے گفتگو نہیں کی۔ یہ نمبر ہر لحاظ سے منفرد خصوصیات کا حامل ہے۔ اس قدر جامع کتاب کم از کم میری نظر سے نہیں گزری۔ اس کے مطالعہ سے قاری کے ذہن میں مولانا آزاد مرحوم کی زندگی کا تمام نقشہ سامنے آجاتا ہے۔

مولانا حکیم محمد ادریس فاروقی بانی ادارہ "مسلم پبلی کیشنز" و ایڈیٹر "مجلہ ضیائے حدیث سوہدرہ" کی فرمائش پر یہ چند سطور میں نے حوالہ قرطاس کی ہیں۔ مجھے بڑی مسرت ہوئی ہے کہ مولانا فاروقی نے اپنے جد محترم کی مطبوعات کو پرنٹ کروا کر منظر عام پر لانے کا کام شروع کیا ہے۔ ازاں قبل آپ نے کوئی تیس ۳۰ کتب چھپوائی ہیں جن میں چھ ان کی اپنی کتب ہیں۔ آپ نے اس جامع اور معلومات افزاء تحریر "نقوش ابوالکلام و مقالات آزاد" کو بہترین کتابی شکل میں شائع کر کے نہ صرف قومی سطح پر ایک اہم فریضہ ادا کیا ہے بلکہ حضرت مولانا مرحوم کی روح پر فتوح کو خوش کیا ہے۔ اللّٰھم زد فزد۔

عبدالرشید عراقی۔ سوہدرہ
۲۸/ جولائی ۲۰۰۰ء

آزاد نمبر

مولانا ابوالکلام آزاد کی جس قدر سوانح عمریاں اب تک شائع ہوئیں اور ان کے حالات سے متعلق جس قدر اخبارات نے آزاد نمبر شائع کیے ہیں کسی نے بھی اس امر کا اظہار نہیں کیا' کہ مولانا آزاد عقیدۃً و مسلکاً اہل حدیث تھے' حتیٰ کہ جمعیۃ العلماء ہند کا آرگن "الجمعیۃ" بھی اپنے آزاد نمبر میں پہلو تہی کر گیا' اور اس باب میں بالکل خاموش رہا ہے' حالانکہ اس امر کی وضاحت نہایت ضروری تھی کہ اتنا بڑا جید عالم جسے "امام الہند" کا خطاب دیا گیا' جو مدتوں جمعیتہ العلمائے ہند کا صدر رہا' عقیدۃً حنفی تھا' یا مالکی؟ شافعی تھا یا حنبلی؟ دیوبندی تھا یا بریلوی؟ مقلد تھا یا غیر مقلد؟ مگر نہ معلوم کیوں سب ہی نے اس میں چشم پوشی کی' شاید اس لیے کہ اگر ان کے مسلک پر بحث کی گئی اور اسے عیاں کر دیا گیا تو جماعت اہل حدیث کا وقار بڑھ جائے گا اور عوام اہل حدیث کی طرف مائل ہونے لگیں گے' حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ مولانا عقیدۃً اہل حدیث تھے' غیر مقلد تھے' تقلید و جمود کو قطعاً پسند نہیں کرتے تھے' آپ نے اپنی اکثر تصانیف میں تقلید کی مذمت کی ہے' اور عالمانہ و محققانہ انداز میں اس کی تردید بھی کی ہے' خصوصاً اپنی آخری کتاب "آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی" میں اس وضاحت سے اس مسئلہ پر روشنی ڈالی ہے' کہ باید و شاید۔ اس لیے ضرورت تھی کہ ہم مولانا کے مذہبی عقائد اور مسلک کو واضح کرتے' اور ان کے جملہ معتقدین کو بتاتے کہ وہ عقیدۃً اہل حدیث تھے' جماعت اہل حدیث سے گہرا تعلق اور پوری راہ و رسم رکھتے تھے' اہل حدیث کے اکثر اجلاس کی صدارت فرمایا کرتے تھے' ان کے جھگڑے نپٹایا کرتے تھے' اور وزارت کے عہدہ پر فائز ہونے کے باوجود مالیر کوٹلہ کے مقدمہ میں دلچسپی لیتے رہے اور ثالثی فرماتے رہے' یہ الگ بات ہے کہ آپ سیاسی مصروفیات کی وجہ سے کوئی خاص جماعتی کام نہ کر سکے' اور ویسی خدمات سر

انجام نہ دے سکے' جیسی کہ دیگر علمائے اہل حدیث سرانجام دیتے رہے۔ یہ اپنا اپنا ذوق ہے لیکن اس بات میں کوئی شک نہیں کہ آپ طبعاً انگریز کے دشمن تھے' انگریزی حکومت کو تباہ و برباد کر کے اپنے ملک کو آزاد دیکھنا چاہتے تھے' اس لیے عمر بھر ساری توجہ ادھر ہی مبذول رہی' اور شاہ اسماعیل شہیدؒ کی طرح نہ مسائل میں الجھے' نہ بحث و مباحثہ میں پڑے' اور کَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا کا نعرہ بلند کرتے رہے۔ اور ہمہ وقت اپنے مشن میں لگے رہے۔

(عبدالمجید خادم سوہدروی)

آزاد کی یاد

(از حکیم سید محمود گیلانی)

یاد ہے آ رہی آج آزاد کی
اس مفسرؔ مبصر کی نقاد کی
اس مبلغ کی عالم کی مناد کی
اس مقرر محرر کی منقاد کی
یاد ہے آ رہی آج آزاد کی

دین و ملت کا وہ رازداں گم ہوا
کیا کہوں، صاحب ترجماں گم ہوا
صاحب طرز، جادو بیاں گم ہوا
ڈھونڈو، وہ ساحر کہاں گم ہوا؟
یاد ہے آ رہی آج آزاد کی

اس کے جانے سے شیریں زبانی گئی
ابر نیساں گیا، درفشانی گئی
دین و ملت کی سب ترجمانی گئی
ضعف پیری ملا، نوجوانی گئی
یاد ہے آ رہی آج آزاد کی

دین قیم کا وہ پاسباں اٹھ گیا
قوم کا تھا جو روح رواں اٹھ گیا
حیف صد حیف قرآں داں اٹھ گیا
وہ حدیثوں کا گنج گراں اٹھ گیا

یاد ہے آ رہی آج آزاد کی

علم و عرفاں کی محفلیں اب کہاں
بند راہیں ہوئیں' منزلیں اب کہاں
گل نصوص و سنن کے کھلیں اب کہاں
زخم قلب و جگر کے سلیں اب کہاں
یاد ہے آ رہی آج آزاد کی

دشمن دین "ثنائی" کا دشمن گیا
جبر و ظلم و غلامی کا دشمن گیا
ہر ستمگر "سوامی" کا دشمن گیا
بدعت انگیز شامی کا دشمن گیا
یاد ہے آ رہی آج آزاد کی

آج قلب عدو سے ندامت گئی
جس سے آتی تھی غیروں کی شامت گئی
اس سے ہندوستاں کی امامت گئی
واں جو اسلام کی تھی علامت گئی
یاد ہے آ رہی آج آزاد کی

ہند کے اب مسلمان مفلوج ہیں
آج گرد ان کے یاجوج ماجوج ہیں
ان کے یاروں کے منہ بھی گئے سوج ہیں
اب وہ چنگیزیوں کو رہے پوج ہیں
یاد ہے آ رہی آج آزاد کی

جب سے ملت کا یہ راز داں اٹھ گیا

قوم کے دل سے سوزِ نہاں اٹھ گیا
سارا احساس سود و زیاں اٹھ گیا
"ہائے ہائے"! وہ ہم دم کہاں اٹھ گیا
یاد ہے آ رہی آج آزاد کی

جس نے جانے نہ دی پیش صیاد کی
جس نے اٹھنے نہ دی تیغ جلاد کی
جس نے بستی جفاؤں کی برباد کی
جس نے جڑ کاٹ دی کفر و الحاد کی
یاد ہے آ رہی آج آزاد کی

امام الہند

(ملک نصراللہ خاں عزیز)

اے امام محترم! اے رہبر عالی مقام
علم و تدبیر و سیاست ہیں ترے در کے غلام
تیری تحریر و خطابت نازش اسلام ہے
تیرا ہر اک لفظ گویا پارۂ الہام ہے
عزم ہر اک لفظ گویا پارۂ الہام ہے
عزم تیرا کوہ پیکر حزم تیرا بے مثال
صدق تیرا بے عدیل اور عدل تیرا لازوال
تجھ پہ کھولے حق نے راز و معنی ام الکتاب
فیض ہے روح القدس کا جس سے تو ہے فیض یاب
تو علم بردار ہے اسلام کی توحید کا
تو امیں ہے اس صدی میں رتبہ تجدید کا
تجھ سے زندہ ہیں مسلماں کی روایات کہن
مستقیم و مخلص و بے خوف و ہمدرد وطن
تجھ سے قائم ہے وطن میں آبرو اسلام کی
تو لگاتا ہے لگن دل میں خدا کا نام کی
کوئی لالچ ہو تو اس لالچ میں آ سکتا نہیں
آسماں بھی رفعتوں کو تیری پا سکتا نہیں
قلب مسلم میں جو نور حریت ہے موجزن
تیرے ہی قول و عمل کی شمع کی ہے وہ کرن
بے نیاز شہرت و عزت غنی مال و جاہ

اللہ اللہ! کتنی اونچی ہے تیرے دل کی نگاہ
عزم و ہمت سے اگرچہ دل تیرا آسودہ ہے
فکر خدمت سے مگر تیری جبیں آلودہ ہے
استقامت میں نہ کوئی لا سکا تیری نظیر
وہ الٰہ آباد کا برنا[1] ہو یا وردھا کا پیر
کانگرس کو فخر تیری فہم کا اخلاص کا
رہنمائے محترم ہے عام کا اور خاص کا
غیر مسلم کو بھی تیرے عدل پر ہے اعتبار
ہے بھرم اسلام کا تیرے سبب سے برقرار
حبذا[2] پھر سوئے قوم بے نوا آیا ہے تو
مژدۂ لا تقنطوا پنجاب میں لایا ہے تو
آہ! وہ پنجاب جو مظلوم ہے مقہور ہے
جس میں باطل مقتدر ہے اور حق مجبور ہے
پانچ دریاؤں سے ریگستان تک سیراب ہے
کشت حریت مگر ویران ہے بے آب ہے
اس کے ایوانوں میں انسانوں کے بکتے ہیں ضمیر
کھول کر بیٹھے ہیں دکانیں شہ و میرو وزیر
جھوٹ کے صدقے میں ہوتے ہیں سروں کے سربلند
اہل حق کے واسطے پاداش حق ہے قید و بند
فرقہ پرور اس طرح پھرتے ہیں اس میں آشکار

---

[1] جوان' نو عمر۔ [2] کلمہ تحسین' بہت خوب'

جس طرح تاریک جنگل میں درندے نابکار
اس متاع ظلم کو شعلہ نوائی چاہیے
خطۂ پنجاب کو بھی رہنمائی چاہیے
پھونک دے خاشاک ظلم و جبر کو تدبیر سے
آگ سی ہر سو لگا دے شعلہ تقریر سے
قافلہ سستا رہا ہے پھر اسے ہشیار کر
سو رہی ہے ملک کی تقدیر اسے بیدار کر
نام ہے آزاد تیرا' ہند بھی آزاد ہو
یہ غلام آباد بھی' آزاد ہو دل شاد ہو

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم

آغازیہ

حضرت مولانا ابوالکلام آزاد رحمہ اللہ کی عظیم شخصیت کسی ایسے تعارت کی محتاج نہیں، کہ ان کی سیرت و کردار کے ایک ایک گوشے کو بے نقاب کیا جائے، اس کی چند وجوہات ہمارے سامنے ہیں:-

ایک یہ کہ مولانا مرحوم نے "تذکرہ" اور غبار خاطر" میں اپنے اور اپنے خاندان کے سوانح ایسی خوش اسلوبی سے قلم بند فرمائے ہیں کہ کسی دوسرے کی تحریر میں وہ خوبی پیدا نہیں ہو سکتی۔

دوسری یہ کہ ان کی خود نوشت داستان حیات۔ "ہندوستان نے آزادی حاصل کرلی" کے زیر عنوان منظر عام پر آچکی ہے۔

تیسری یہ کہ مولانا کی رحلت کے بعد بہت سے اہل قلم نے آپ کے حالات پر کافی خامہ فرسائی کی ہے اور بہت سے اہل قلم ان کی سیرت نگاری کے لیے تیار بیٹھے ہیں۔ اور یہ کام بعد میں بھی ہوتا رہے گا۔

ان حالات میں "اہل حدیث" کا آزاد نمبر شائع کرنا اور بالخصوص اس وقت کہ ان کو انتقال فرمائے ۱۲ سولہ مہینے گذر چکے ہوں، کچھ زیادہ موزوں نہ تھا ------ لیکن مولانا کے بعض پوشیدہ کرداروں اور سربستہ رازوں نے ہمیں مجبور کیا کہ ان کو منکشف کرنے، کھولنے اور منظر عام پر لانے کے لیے "آزاد نمبر" کے نام سے "جریدہ اہل حدیث" کی ایک اشاعت وقف کی جائے۔

مولانا ابوالکلام آزاد سے متعلق وہ پوشیدہ کردار اور سربستہ راز کیا ہیں؟ اور

کہاں سے حاصل ہوئے ہیں؟ اس کا مفصل جواب تو آپ کو آئندہ صفحات میں ملے گا' ہاں! اس تفصیل کا تھوڑا سا اجمال یہ ہے' کہ اگرچہ علمی اور ادبی لحاظ سے مولانا کی ذات کو پاکستان اور ہندوستان میں یکساں مقبولیت حاصل ہے' اور ان کے موافق اور مخالف سبھی اس بات کے متفقہ طور پر معترف ہیں' کہ آزاد مرحوم ایک بے بدل عالم' ایک بے مثال خطیب' ایک بے نظیر صاحب قلم' ایک بے عدیل ادیب اور ایک بے باک نباض تھے' لیکن شاید آپ یہ سن کر حیران ہوں' کہ مولانا کے حقیقی مقام اور صحیح کردار کو نہ ہندوستان میں کوئی شخص سمجھ سکا ہے نہ پاکستان میں' اور انہوں نے جس عظیم اور مقدس مقصد کو پانے کے لیے اپنی عمر عزیز صرف کر دی' اس مقصد کی تہ تک پہنچنے کی شاید کسی کو فرصت ہی نہیں ملی' یا کسی کا فہم و درک وہاں تک رسائی حاصل نہیں کر سکا۔

ہندوستان میں آزاد کے متعلق صرف یہی سمجھا جاتا ہے کہ وہ ایک بلند پایہ سیاسی لیڈر تھے جو ابتداء سے انتہاء تک کانگریس سے وابستہ رہے' اور ہندوستانیوں کو انگریز کی غلامی سے نجات دلانے کے لیے مصروف پیکار رہے' اور بالآخر ۱۹۴۷ء میں بھارت کو آزاد کرا کے کامیاب ہوئے۔ پاکستان میں یہ سمجھا جا رہا ہے' کہ مولانا مرحوم پاکستان' قیام پاکستان' مصور پاکستان اور معمار پاکستان کے سخت ترین مخالف تھے' دو قومی نظریہ کو انہوں نے کبھی قبول نہیں کیا' اور تقسیم ملک کی انہوں نے اس وقت بھی شدید تر مخالفت کی' جب کہ گاندھی' نہرو' پٹیل' ٹنڈن ایسے بھارتی لیڈر جھک گئے تھے' اور نظریہ پاکستان کو قبول کر چکے تھے' اور بعض پاکستانی تو یہاں تک کہنے سے نہیں چوکتے کہ مولانا آزاد متحدہ ہندوستان کے دس کروڑ مسلمانوں کو انگریز کی غلامی سے نکال کر ہندوؤں کی غلامی میں دے دینا چاہتے تھے' اَعَاذَنَا اللّٰهُ مِنْهَا۔

مگر یہ خدائے علیم کا فضل و کرم ہے' کہ اس نے مولانا کے نظریات اور فلسفیات کو سمجھنے اور بخوبی سمجھنے کی ہمیں توفیق بخشی' اور ہمیں مولانا کی اپنی تحریرات ہی سے یہ ثابت ہو گیا کہ مرحوم پچپن (۵۵) برس تک ہندوستانی مسلمانوں کو

جھنجھوڑتے اور خوابِ غفلت سے جگاتے رہے' اور اشاروں ہی اشاروں میں سمجھاتے رہے' کہ ہندوستان کی جو عظیم سلطنت تمہارے ہاتھ سے کھو گئی ہے' اس پر دوبارہ قابض ہونے کے لیے تیار ہو جاؤ' وہ متحدہ ہند کے تمام مسلمانوں کو بیدار دیکھنا چاہتے تھے' اور سارے بھارت میں ایک عظیم مسلم حکومت کے قیام کے دلکش اور سہانے خواب دیکھ رہے تھے' مگر انہوں نے ایک گہری پالیسی وضع کر رکھی تھی' کہ ہندوستان میں ازبسکہ غالب اکثریت ہندوؤں کی ہے' اس لیے جب تک مسلمان ان کے ساتھ متحد ہو کر ملک کو انگریز کی غلامی سے نجات نہ دلائیں گے' وہ تنہا اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ ان کی حکمت عملی یہ تھی کہ رفتہ رفتہ ایسے اسباب پیدا کر لیے جائیں' کہ بالآخر سارا ہندوستان' اسلامستان بن جائے' اور اس میں خلافت اسلامیہ قائم ہو جائے اس کی تفصیل اگلے اوراق میں بیان ہو گی' اور آپ دیکھیں گے کہ ہم نے کس سعی بلیغ اور فکر رسا سے مولانا کے اس نظریئے کو سمجھا ہے---- البتہ جو حضرات مولانا آزاد کے حالات سے کما حقہ واقف نہیں ہیں' ان کی معلومات کے لیے ذیل میں کچھ حالات قلم بند کیے جا رہے ہیں۔ جو مختصر اور جامع ہونے کے باوجود بہت مفید اور معلومات افزا ثابت ہوں گے۔

ولادت

مولانا آزاد کی خوش قسمتی پر کون رشک نہ کرے گا' کہ آپ نومبر ۱۸۸۸ء مطابق ذی الحجہ ۱۳۰۵ھ کی ایک درخشندہ صبح کو مرکز اسلام مکہ معظمہ میں منصہ شہود پر جلوہ آراء ہوئے' آپ کے والد بزرگوار مولانا سید خیرالدین احمد' غدر ۱۸۵۷ء کو ہندوستان میں برطانوی جبرو تشدد سے تنگ آ کر مکہ معظمہ تشریف لے گئے' اور مدینہ منورہ کے مفتی اکبر شیخ محمد طاہر کی بھانجی سے ان کی شادی ہو گئی' اسی خاتون محترم کے بطن سے دار الامن و الامان کے محلہ قدوہ متصل باب السلام میں قدرت کاملہ

مولانا آزاد کو کتم عدم سے عالم وجود میں لائی۔

آپ کا ذاتی نام محی الدین احمد اور تاریخی نام "فیروز بخت" رکھا گیا' جو بعد میں صرف "احمد" رہ گیا' لیکن آپ کی کینت "ابو الکلام" اور آپ کے لقب "آزاد" نے آپ کے اصلی نام پر کچھ ایسا پردہ ڈالا' کہ معدودے چند لوگوں کے سوا اس کا کسی کو علم نہ ہو سکا' اور آپ کو "ابوالکلام آزاد" ہی پکارا جانے لگا' استاذ الشیخ محی الدین الالوائی الازہری آپ کے حالات میں لکھتے ہیں:

وَ اِنَّ اَبَا الْکَلَامِ الَّذِی وُلِدَ فِی مَکَّۃَ عِنْدَ بَیْتِ اللّٰہِ الْحَرَامِ فِی الْحَادِی عَشَرَ مِنْ شَھْرِ نُوفَمْبَرِ عَامَ ۱۸۸۸ء الْمُوَافِقِ لِذِی الْحَجَّۃِ عَامَ ۱۳۰۵ بَعْدَ ھِجْرَۃِ النَّبَوِیَّۃِ بِمَنْزِلِ اُسْرَتِہٖ الْمُتَّصِلِ بِبَابِ السَّلَامِ لِلْحَرَمِ الشَّرِیْفِ نَشَأَفِی اُسْرَۃٍ عَرَبِیَّۃٍ خَالِصَۃٍ فِی وَادٍ غَیْرِ ذِی ذَرْعٍ وَ سُمِّیَ مُحْیُ الدِّیْنَ اَحْمَدُ وَ کُنْیَتُہٗ اَبُو الْکَلَامِ وَ لَقَبُہٗ اٰزَادَ وَ لَقَبُ شَرْفِہٖ اِمَامُ الْھِنْدِ۔

حسب و نسب

مولانا آزاد خاندان سادات سے تعلق رکھتے ہیں' آپ کے ایک بزرگ شیخ السید جمال الدین عہد اکبری میں معروف عالم و صوفی تھے' آپ کے والد ماجد سید خیر الدین احمد بھی شیخ طریقت اور عالم فاضل بزرگ تھے' خاندان میں سلسلہ پیری مریدی جاری تھا' اور آپ کے والد کے بھی لاکھوں مرید و معتقد ہندوستان بالخصوص کلکتہ وغیرہ میں موجود تھے' ایک روایت کے مطابق ان کا اصلی وطن پنجاب ہے' اور ان کے بزرگوں نے قصور ضلع لاہور کے کسی گاؤں میں سکونت اختیار کی تھی۔[1] مگر بعد میں ان کا وطن دلی ہو گیا' آپ کے ننھیال مدینہ منورہ میں تھے۔

---

[1] اور بعض راویان نے ضلع گوجرانوالہ کے ایک گاؤں کا نام لکھا ہے۔

تحصیل علوم

ابوالکلام مرحوم ولادت کے بعد دس سال تک مکہ معظمہ ہی میں اپنے والدین کے زیر سایہ رہے' اور ان کی تعلیم و تربیت کا آغاز بھی اسی دیار محترم میں ہوا' آپ کی والدہ ماجدہ اور والد بزرگ نے خود اپنی نگرانی اور اپنی شاگردی میں ان کو رکھا اور اس طرح رکھا' کہ آزاد تھوڑی ہی مدت میں جملہ علوم دینیہ و اسلامیہ میں عبور کامل پا گئے۔

آپ کے والد انگریزی تعلیم اور مغربی تہذیب و معاشرت کے سخت خلاف تھے' اور آپ کی والدہ تو ایک عرب خاتون تھیں' جنہوں نے اس ارض پاک میں آنکھیں کھولیں' اور پرورش پائی تھی' جس کو رسول اللہ ﷺ کے قدوم مبارک نے عرش و فرش کا مرتبہ بخشا تھا' پس ان دونوں بزرگواروں نے ایک لحہ کے لیے بھی یہ پسند نہ کیا' کہ ان کا نور نظر اسلامی ماحول کو چھوڑ کر کوئی اور سوسائٹی اختیار کرے' اور دینی علوم کو ترک کر کے مغربی علوم کی تحصیل میں لگ جائے۔ ادھر صاحبزادۂ عالی قدر نے دماغ ایسا مصفّیٰ اور روشن پایا تھا' کہ جو کچھ ایک دفعہ سنا حفظ ہو گیا' جو کچھ ایک دفعہ پڑھا مدۃ العمر کے لیے یاد ہو گیا' اس پر ذوق تعلیم اس قدر کہ ہمہ وقت حصول علم میں محو رہتے' ان کے ہم عمر بچے کھیلتے کودتے اور لہو و لعب میں مشغول نظر آتے' مگر آزاد کتابوں کے کیڑے بن گئے' گھر سے سیر سپاٹے کو نکلتے اور تفریح طبع کے لیے بھیجے جاتے' لیکن کوئی مناسب جگہ تلاش کر کے مطالعہ کتب میں لگ جاتے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ بارہ تیرہ سال ہی کی عمر میں تمام علوم ضروریہ دینیہ و مروجہ سے فارغ ہو گئے' اور عربی فارسی کی بڑی بڑی ضخیم و ادق (مشکل اور پیچیدہ) کتابیں ختم ہی نہیں بلکہ حفظ کر ڈالیں۔ درس نظامی کا دس سالہ کورس جو بڑی عمر والے آسانی سے پورا نہیں کر پاتے ہیں' آپ نے کم سنی ہی میں مکمل کر لیا' اور عربی زبان تو گویا ان کی مادری زبان تھی کہ فرفر بولتے' فصاحت بلاغت سے بولتے اور بامحاورہ

بولتے تھے۔

آپ کی ذہانت

پھر فہم و شعور اور درک و حافظہ کا یہ عالم تھا' کہ جب لکھتے اور بولتے تو اچھے خاصے ماہرین علم حیران رہ جاتے اور یقین ہی نہ کرتے کہ آزاد اس کم عمری میں ایسا اچھا لکھ اور بول سکتے ہیں' اس کی بہت سی مثالیں حیرت میں ڈالنے کو موجود ہیں' گیارہ بارہ سال کی عمر میں شاعری کا آغاز کیا' اور اردو' فارسی' عربی میں بے تکلف شعر کہنے لگے' اور مشاعروں میں جانے لگے۔ پھر پندرہ سولہ سال کی عمر میں اخباروں اور رسالوں کے ایڈیٹر بھی بن گئے اور دوسرے تو رہے ایک طرف خواجہ الطاف حسین حالی اور مولانا شبلی اور مولانا وحید الدین سلیم جیسے یگانۂ روزگار اہل علم آپ کو دیکھ کر ششدر رہ گئے۔

علوم جدیدہ مغربیہ

یہ مولانا آزاد کی ذہانت و فطانت ہی کا کرشمہ تھا' کہ باوجودیکہ انہوں نے کسی درس گاہ میں انگریزی کا ایک لفظ تک نہ پڑھا تھا' مگر جب ضرورت متقاضی ہوئی' تو انہوں نے کسی استاد کی مدد لیے بغیر تمام علوم مغربیہ جدیدہ میں دستگاہ کامل حاصل کر لی' کوئی علم و فن ایسا نہ تھا' جس کی نسبت کامل معلومات آپ نہ رکھتے ہوں' انگریزی سیکھی اور اس قدر سیکھی' کہ وہ مشکل ترین کتابیں' جن کا ایک لفظ کالجوں کے پرنسپل اور پروفیسر' عدالتوں کے ایڈووکیٹ اور مجسٹریٹ' اسمبلیوں کے اسپیکر اور منسٹر نہیں سمجھ سکتے تھے' آزاد مرحوم چٹکی بجانے میں ان کو حل کر کے رکھ دیتے' اور نہ صرف اسی قدر' بلکہ بڑی سے بڑی انگریزی کتاب اور اس کے معروف ترین مغربی مصنف کے عیوب و نقائص ظاہر کر کے اس کی دھجیاں اڑا دیتے۔

لیکن عام لوگوں میں یہ مشہور ہے کہ مولانا آزاد انگریزی علوم سے مطلق بے بہرہ تھے' اور اسی بنا پر انہوں نے ان کے متعلق بہت سی بے بنیاد روایتیں گھڑ لیں اور ایسے ایسے ڈھکوسلے (جھوٹ) تصنیف کر لیے کہ ان کو سن کر حیرت بھی ہوتی ہے اور ہنسی بھی آتی ہے' ان دنوں عجیب و غریب بے سروپا قصے خصوصیت سے تیار کیے گئے' جب برطانوی کمیشن ہندوستان میں کانگریس اور مسلم لیگ کی مفاہمت کے لیے آتے' اور مولانا آزاد کانگریس کے صدر کی حیثیت کمیشن کے سامنے ہندوستان کی ترجمانی کرتے تھے' اس وقت یہ مشہور کیا گیا' کہ مولانا جب بھی ارکان کمیشن کے سامنے جاتے ہیں' ایک دو ہندو لیڈر ان کے ساتھ ہوتے ہیں' جو فریقین میں ترجمان کا کام دیتے ہیں' آزاد صاحب چونکہ انگریزی نہیں جانتے' اردو ہی میں گفتگو کرتے ہیں' اس لیے جب ان کی زبان سے "ہندو مفاد" کے خلاف کوئی لفظ نکل جاتا ہے' تو ہندو لیڈر اس کا غلط ترجمہ کر کے کمیشن کو اس کا مطلب کچھ اور ہی بتاتے ہیں' اسی قسم کی اور بھی بہت سی باتیں ان سے منسوب کی گئیں' جو اپنے اندر ذرا بھی حقیقت نہیں رکھتیں' اور جو بات حقیقت رکھتی ہے' وہ یہی ہے کہ آزاد جہاں علوم شرقیہ' عربیہ' اسلامیہ میں کامل دسترس رکھتے تھے' وہاں انہوں نے اپنی خدا داد ذہانت سے علوم جدیدہ غربیہ میں بھی بلا امداد اتالیق ایسی مکمل دستگاہ پائی' کہ ماہرین فن کی آنکھیں استعجاب سے کھلی رہ گئیں' اور انہوں نے آزاد کے تبحر علمی کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے' یہی وجہ ہے کہ آزاد کے دوست اور دشمن سب ہی ان کی فضیلت علمی کے معترف تھے۔

خلوت پسندی

آزاد مرحوم ابتداء سے ہی تنہائی پسند تھے' عام طور پر خلوت نشیں ہو کر مسائل مختلفہ پر غور و فکر فرماتے' اور اپنے فہم و شعور کو کام میں لا کر اس سے بڑے

بڑے عقدے کھلوانے اور الجھی ہوئی گتھیاں سلجھانے میں مدد لیتے۔ طالب علمی کے زمانے میں سحر خیزی کی عادت پڑی' جس نے آخر دم تک ساتھ دیا' وقت سحر بیدار ہوتے' وضو کرتے' نوافل تہجد ادا کرتے اور نماز صبح شروع ہونے سے پہلے پہلے مطالعہ میں مصروف ہو جاتے یا تحریری کام کرتے' اور اس وقت کی بہت ہی تعریف کرتے' ان کا اپنا قول ہے' کہ جو شخص سحر کا وقت سونے میں یا کسی اور بے کار مشغلہ میں کھو دیتا ہے وہ اپنے دل و دماغ پر' اپنے نفس پر اور اپنی روح پر بھاری ظلم کرتا ہے' اور یہ سحر خیزی کی عادت انہوں نے اپنے والد سے سیکھی تھی۔

سحر خطابت

یہ بات اور بھی تحیر انگیز ہے' کہ ابو الکلام آزاد پندرہ برس کی عمر میں اچھے خاصے مقرر اور خطیب بھی بن گئے' ان کی سب سے پہلی تقریر ۱۹۰۳ء میں ایک جلسہ میں ہوئی' پھر ۱۹۰۴ء میں انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ جلسہ میں تقریر فرمائی اس وقت وہ صرف سولہ سال کے تھے' اتنی چھوٹی سی عمر میں تقریر و خطابت کا یہ ملکہ انہوں نے اس طرح پایا' کہ ان کے والد نے ان کو طلبائے دینیات کو پڑھانے اور درس دینے پر مقرر کر دیا۔ یہ طلباء ان سے عمر میں بہت بڑے تھے' اس طرح درس دینے اور پڑھانے سے طبیعت کھل گئی' جھجک جاتی رہی' اور پھر تو ان کے ایسے جوہر کھلے کہ دنیا عش عش کر اٹھی جس اجتماع میں انہوں نے تقریر کے لئے جانا ہوتا' لوگوں کا جم غفیر اللہ آتا' مخالف اور موافق' دشمن اور دوست سب کو ان کی خطابت سننے کا عشق ہوتا' طرز تکلم ایسا دل نشیں اور پر کشش تھا کہ سامعین وجد میں آ جاتے' الفاظ ایسے نپے تلے کہ دلوں میں اترتے جاتے' فقرے ایسے جاذب اور چست کہ مدۃ العمر کانوں میں گونجتے رہتے' اور سب سے بڑی بات یہ' کہ ہر بات ہر مسئلہ کا استدلال آیات قرآنیہ' اور احادیث نبویہ سے فرماتے' یہ ایک ایسی خدا داد فضیلت

ہے جو بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے' کہ کوئی ادیب یا مقرر اپنی تحریر اور تقریر کے ایک ایک فقرے کا استشہاد قرآن کریم اور حدیث رسول اللہ ﷺ سے کرے اور یہ فضیلت اللہ تعالیٰ نے ابوالکلام آزاد کو ودیعت فرمائی تھی' جسے سن کر مسلمان' اور غیر مسلم سب انگشت بدنداں رہ جاتے۔ جو مطلب کوئی گھنٹوں کی سر مغزی سے ادا نہ کر سکتا' آزاد اس کو چند فقروں میں ادا کر دیتے' لطف یہ کہ جن کی سمجھ میں آتا وہ بھی سر دھنتے جو نہ سمجھ سکتے وہ بھی مست ہو ہو جاتے۔ اور اس کا جذب و اثر قبول کر کے لوٹتے۔

جادو نگاری

جس طرح آزاد کی سحربیانی لوگوں سے تحسین و عقیدت کا خراج وصول کرتی تھی' اسی طرح ان کا طلسم تحریر بھی ہر شخص پر اپنا جادو کر دیتا تھا' اس صاحب طرز ادیب و صحافی کے مقالات پڑھ کر اس کے احباء اور اعداء مسحور ہو ہو جاتے تھے' نگارش کا نہج ایسا دلفریب اور ساحرانہ ہوتا کہ ایک ایک سطر قلب کو مسخر کر لیتی اور یہی جی چاہتا' کہ بار بار پڑھیں اور سیر نہ ہوں' ہزار بار پڑھیں اور لطف اٹھائیں۔ اب یہ بھی سن لیجیے کہ مولانا آزاد نے کسی پختہ عمر کو پہنچ کر قلم نہیں اٹھایا' بلکہ جس عمر میں شاعری اور خطابت شروع کی اسی عمر میں اپنے خامہ کو بھی حرکت دی۔ چودہ پندرہ سال کی عمر ہوتی ہی کیا ہے' اس میں تو بچوں کو کھیل کود اور تفریحی مشاغل سے ہی فرصت نہیں ملتی' لیکن ابوالکلام آزاد ہے' کہ اس کم سنی میں بھی علمی اور ادبی مشغلوں سے کھیل رہا ہے' اس کے مضمون جب اخبارات و رسائل میں چھپتے تو دنیا انہیں حیرت سے پڑھتی اور واہ واہ کرتی' اور پڑھتی ہی جاتی۔

آج جس کو دو حرف لکھنے آ جاتے ہیں' وہ اپنے راہوار قلم کو سیدھے اور صاف رستے پر دوڑانے کے بجائے ٹیڑھی راہوں پر بھگاتا ہے اور اس طرح خود بھی

بھٹک جاتا ہے‘ دوسروں کو بھی گمراہ کرتا ہے۔ دور حاضر کے ادیب "ترقی پسند مصنف" تو بن جاتے ہیں‘ مگر ان کی تحریریں فحاشی و بے حیائی کے روپ میں بازار میں آتی ہیں‘ تو دین و ملت کا ماتھا عرق ندامت و غیرت سے ٹپکنے لگتا ہے اور فرزندان اسلام اسلاف کی روایات چھوڑ کر شیطانی طریقوں کو اختیار کرنے لگتے ہیں۔

لیکن آزاد کا قلم ہمیشہ دین و ملت کی خدمت و اشاعت‘ قرآن و سنت کے احیاء و بقاء اور کلمتہ الحق کے اعلاء کے لیے وقف رہا‘ انہوں نے جو کچھ لکھا‘ باطل کو مٹانے اور علم صداقت کو سربلند کرنے کے لیے لکھا‘ اور یہ وہ وصف ہے‘ جو کسی صاحب قلم میں بہت کم پیدا ہوتا ہے‘ جس کو یقین نہ آئے‘ وہ الہلال‘ البلاغ‘ لسان الصدق وغیرہ کو دیکھے اور آزاد کی تصنیفات مثل غبار خاطر‘ تذکرہ‘ ترجمان القرآن وغیرہ پڑھے‘ اور دیکھے کہ مرحوم نے اللہ کے پسندیدہ دین اور ملت بیضاء کی کیا کیا خدمات سرانجام دی ہیں‘ اور خواب غفلت میں خراٹے لینے والے مسلمانوں کو شانے سے پکڑ کر کس طرح بیدار کیا‘ جھنجوڑا اور ان کو صراط مستقیم پر چلنے کے لیے مستعد کیا ہے‘ حق یہ ہے یہ کام وہی کر سکتا ہے‘ جس کے دل میں قوم کا درد اور درد میں بے پناہ تڑپ ہو۔

اوصاف وخصائل

مولانا ابوالکلام آزاد کے عادات و اطوار اور خصائل و فضائل پر کچھ لکھنا تحصیل حاصل ہے‘ اس لیے کہ مرحوم از سر تا بہ قدم اوصاف حمیدہ میں ڈوبے ہوئے تھے‘ یہاں تک کہ ان کے مخالفین و معاندین بھی ان کے محاسن و محامد کے معترف اور ان کے خصائل کے مداح تھے‘ آزاد مرحوم نے زندگی میں اپنے لیے ایک ایسا مقام پیدا کیا‘ جس میں چاروں طرف سے خوبیاں ہی خوبیاں نظر آتی تھیں‘ اور جو عام لوگوں کے عیوب و نقائص سے یکسر پاک تھا‘ ہم ان کو معصومیت کا درجہ تو نہیں

دے سکتے، البتہ یہ کہنے میں کوئی باک محسوس نہیں کرتے کہ وہ ان صفات سے متصف تھے، جو ایک اعلیٰ انسان میں ہونے چاہئیں۔ وہ متواضع تھے، حلیم و منکسر تھے، مرنجاں مرنج تھے، ہم مذہبوں کے مصائب دیکھ کر سخت برہم ہوتے، اور فوراً اس کا مداوا سوچنے میں مصروف ہو جاتے۔ اسلامی احکام کے سخت پابند تھے، اور شریعت کے کسی حکم کی تعمیل میں غفلت و کوتاہی کو برداشت نہ کرتے تھے، اسلامی روایات پر چلنا فخر سمجھتے تھے، اور نہ صرف اسلاف کے راستے پر خود گامزن رہتے تھے، بلکہ دوسروں کو یہی راہ اختیار کرنے کی تلقین فرماتے تھے۔ ۱۹۴۶ء میں جب عبوری حکومت متحدہ ہندوستان میں قائم ہوئی، تو مولانا آزاد کو وزارت تعلیم کا قلم دان سونپا گیا، آپ آخری دم تک اس منصب پر فائز رہے، لیکن آپ کا طرز زندگی اور طریق کار دوسرے وزراء کے طرز و طریق سے بالکل جداگانہ تھا، سرکاری بنگلہ تو ملا ہی تھا، لیکن آپ نے اس پر کوئی دربان اور پہرے دار مقرر نہیں کیا، کسی شخص کو آپ سے ملاقات کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی تھی، پھر آپ کے اپنے دفتر میں نہ تو کوئی کلرک تھا، نہ سپرنٹنڈنٹ، ایک پرائیویٹ سیکرٹری تھا، وہ بھی برائے نام۔ سارا کام مرحوم خود ہی انجام دیتے تھے، وزارت کی چیکنگ آپ نے کبھی نہیں کی، اور بہت کم اس کی دیکھ بھال بھی کی، مگر خوبی یہ کہ منسٹری کی تمام مشینری از خود نہایت خوش اسلوبی اور پوری قوت سے سرگرم عمل رہی، اور اس میں کوئی نقص نہیں پیدا ہونے پایا۔

زمانہ وزارت میں جو دوست آتا، اس کا پرتپاک خیر مقدم کرتے اور اس کی خاطر مدارات میں خود مصروف ہو جاتے وزیر ہونے پر بھی مشرقیت اور اسلامیت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا، لباس اور خوراک میں وہی سادگی تھی جو پہلے کے حالات میں تھی، علم و عرفان کی مجلسیں اب بھی جگمگاتی تھیں، جلسوں اور محفلوں کی رونقیں اب بھی بڑھاتے تھے، اور اپنوں بیگانوں کو اپنے مفید مشوروں سے ہمیشہ مستفید کرتے تھے۔ رَحِمَہُ اللّٰہُ رَحْمَۃً وَّاسِعَۃً وَ تَغَمَّدَہُ اللّٰہُ بِغُفْرَانِہٖ۔

تردید بدعات

مولانا ابوالکلام آزاد خالصتاً موحد تھے' اور آپ صرف کتاب اللہ اور حدیث نبوی سے تعامل و تمسک رکھتے تھے' اس لیے آپ بدعت اور گمراہی سے سخت نفرت کرتے تھے' نہ صرف اپنی ذات کو اس سے محفوظ رکھتے تھے' بلکہ مسلمانوں میں اس کا ایک شمہ تک بھی دیکھنا نہیں چاہتے تھے۔

ایک دفعہ ایک اسلامی جلسہ میں حدیث نبوی کے ایک ٹکڑے "كُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ وَّ كُلُّ ضَلَالَةٍ فِي النَّارِ" کی ایسی خوب صورت وضاحت فرمائی' کہ دیوبندی اور اہل حدیث سبھی جھوم رہے تھے' اور اہل بریلی بھی سردھن رہے تھے۔

دہلی میں ایک بار اہل حدیث کانفرنس کی صدارت فرمائی اور اپنی افتتاحی تقریر میں مسلمانوں کو یوں مخاطب فرمایا:

"برداران عزیز! آپ اس اسلام کے علمبردار ہیں' جس کو حق جل شانہ' نے اپنا محبوب اور پسندیدہ دین بنا کر تمام اہل عالم کی راہنمائی کے لیے بھیجا' اور محمد رسول اللہ ﷺ کو جس کا آخری پیغام رساں بنایا۔ پس اسلام کا یہ اولین تقاضا ہے' کہ آپ سے توحید کا اقرار کرائے' اور آپ کو بدعات و محدثات سے دور رکھے کیا آپ نہیں جانتے؟ کہ ایک حدیث کی رو سے جو شخص دین میں نئی راہیں نکالتا اور نئے احکام و مسائل تراشتا ہے' وہ اسلام سے دور ہٹ کر مردود بن جاتا ہے' اور جس کو "لیس منا" کا وعید صاف بتاتا ہے' کہ اس مردود و بدعتی کا کوئی تعلق نہ اسلام سے قائم رہتا ہے' نہ اسلام کے آخری پیامبر حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ سے' پس بدعت کی نئی راہیں تلاش کرنے والوں کو یہ سوچ لینا چاہیے کہ جب وہ خدائے عظیم' محمد رسول اللہ ﷺ اور اسلام ہی سے بے تعلق ہو گئے' تو دنیا اور آخرت میں ان کا مسکن کہاں بنے گا؟ دوزخ اور ہاویہ! جس کے شعلوں سے

شیطان سرکش نے بھی پناہ مانگی ہے' اور جس کے تصور سے سخت و سنگ پہاڑ بھی لرز اٹھتے ہیں۔" ("تنظیم ملت"۔ دہلی)

یوں بھی دیکھنا چاہیے کہ جس شخص کی ساری عمر کلام اللہ شریف کی تفہیم و تدریس اور تفسیر و توضیح میں گذری ہو' اور جس نے حیات عزیز کا ایک وافر حصہ حدیث و سنت کے تحفظ و تعلم میں صرف کیا ہو وہ کیونکر برداشت کر سکتا تھا' کہ بدعت اور ضلالت اس کے قریب آئے؟ اور اسے کیونکر گوارا تھا کہ اسلام کو ماننے والے' توحید و سنت کا سرمایہ رکھنے کے باوصف محدثات کا شکار ہو جائیں؟ اور اپنے دین و ایمان اپنے اصول و اعتقاد کو تباہ کر لیں۔

آزاد نے تو بسا اوقات مسلمانوں کی اس خانقاہیت پر بھی نفرین بھیجی ہے' جو ضلالت و جہالت اور شرک و بدعت کا سرچشمہ ہے درحقیقت مزارات' خانقاہیں' دائرے اور اوقاف گمراہی کے مرکز ہیں' جہاں توحید الٰہی کا فقدان دیکھا جاتا ہے وہاں مشرکانہ اعمال پرورش پاتے ہیں' دین حنیف اور اس کے مقاصد کا جنازہ اٹھتا ہے اور رحمانیت کے جلوے دب کر شیطانیت کے شعلے بھڑکتے ہیں' اسی لیے مولانا اپنی ایک تحریر میں فرماتے ہیں:

"اوقاف کے غیر محتاط متولیوں کی نگرانی اور ان کے عیش پرستانہ اخراجات کی نگہداشت بھی ملک کے اندرونی امن کو بحال رکھنے میں مدد دینے والا جزو ہے' ہمارے ملک کی عقیدت کیشی نے ایسے لاکھوں اوقاف کو تخلیق کیا ہے' جن سے ہزاروں' مفید خلائق امور انجام پا سکتے ہیں' ہمیں کبھی نہ کبھی ایسا کرنا ہی پڑے گا۔"

ایک اجتماع میں فرمایا:

"جب میں ہندوستانی مسلمانوں کے مذہبی حالات کا جائزہ لیتا ہوں' تو میری آنکھوں کو اشک ہائے غم سیراب کر دیتے ہیں' اور اس فکر میں غوطے کھانے لگتا ہوں' کہ اندھی عقیدت جس قدر سرعت کے ساتھ ان کی

متاع ایمان کو لوٹ رہی ہے' ایک دن وہ اپنا رنگ لا کر رہے گی' اور غیر اللہ کی پرستش ان کے دینی' قومی' سیاسی اور معاشرتی مسائل کو مٹی میں ملا کر ان کو اس جادۂ ابلیس پر چلائے گی' جس کا نام شریعت کی اصطلاح میں بدعت ہے' جس کو اختیار کرنے سے پہلی امتیں برباد ہو گئیں اور اس امت کا خدا معلوم کیا حال ہو گا؟ جب تک مسلمان اس سے توبہ نہ کریں وہ دین و دنیا میں کبھی فائز المرام نہیں ہو سکتے۔" (البصائر)

مولانا کی ان تحریرات کو پڑھئے اور بار بار پڑھئے' اور ان کے ایک ایک فقرے' اور ایک ایک لفظ پر غور کیجیے' کہ مرحوم کس انداز سے مسلمانوں کو بدعات سے محترز رہنے' غیراللہ کی پوجا سے بچنے اور خانقاہی کو خیرباد کہنے کی تلقین فرما رہے ہیں' اور خالص اس بات پر زور دے رہے ہیں کہ وہی راستہ اختیار کیا جائے' جو اللہ نے پسند کیا' اور محمد رسول اللہ ﷺ نے بتایا ہے' آپ دینی مجالس اور اسلامی اجتماعات میں اہل اسلام کو محدثات ترک کرنے کی تاکید فرماتے رہتے' اور یہی کہتے سنائی دیتے' کہ اگر مسلمان دین اور دنیا میں کامیاب ہونے کے متمنی ہیں تو وہ اسلام میں نئی راہیں نہ نکالیں' نئے رستے نہ ڈھونڈیں' اور صرف وہی جادۂ عمل اختیار کریں جو قرآن و سنت نے بتایا ہے۔

آزاد مرحوم اکثر اوقات اپنی مجلسوں یا دینی اور قومی اجتماعات میں ضلالت' بدعت اور خانقاہیت کے خلاف پند و مواعظ کے موتی بکھیرتے رہتے' اس سلسلے میں مولانا مقبول احمد سیوہاروی ایک واقعہ یوں قلم بند کرتے ہیں:

"کلکتہ میں عید الفطر کے موقعہ پر اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ ملاقات عید کے لیے مولانا کی کوٹھی پر گیا' اسی دن عید ملاپ کی تقریب بطور میلہ کے اسپلینڈ کے میدان میں منائی جا رہی تھی' ایک صاحب نے سوال کیا' کہ حضرت! یہ عید ملاپ تو "بدعت" ہے' مولانا نے بدعات پر جو تقریر فرمائی' وہ راقم الحروف کے کانوں میں آج تک گونج رہی ہے۔ بدعات کا سرچشمہ کب

پھوٹا؟ بدعات کا بانی کون تھا؟ بدعات کی شدت کس زمانہ میں ہوئی؟ اس سلسلہ میں مدقوق چرکسی کے حالات بھی بیان فرمائے' پھر کتابوں کے حوالے بقید صفحہ و سطر بتائے کہ سننے والوں کو محسوس ہو رہا تھا کہ پر شکوہ الفاظ اور نورانی ترکیبوں کا القا ہو رہا ہے' جسے ایک پیکر علم اپنی زبان سے ادا کر رہا ہے۔" ("الجمعیۃ دہلی"۔ آزاد نمبر)

جن ایام میں مولانا آزاد اخبار "وکیل" امرتسر میں کام کرتے تھے' ان دنوں ان کی ملاقاتیں حضرت مولانا ابو الوفاء ثناء اللہ مرحوم سے بھی ہوا کرتی تھیں' اور توحید و سنت کے یہ دونوں علمبردار احیاء و بقائے کتاب و سنت سے متعلق مشاورت فرمایا کرتے تھے۔ ایک دفعہ مولانا ثناء اللہ کی فرمائش پر آزاد مرحوم نے "اہل حدیث" امرتسر کے لیے ایک مقالہ تحریر فرمایا' جو بدعات کی تردید میں شمشیر قاطع کا حکم رکھتا تھا' اس میں ایک جگہ آپ لکھتے ہیں:

"تم یہ تو سوچو کہ اگر تم نے لاہور سے دہلی جانا ہو' لیکن تم کو کراچی جانے والی گاڑی میں بٹھا دیا جائے' اور وہاں پہنچ کر تم بھٹکنے لگو' دربدر ٹھوکریں کھاؤ' اور منزل مقصود ہاتھ نہ آئے' تو تمہیں کس قدر دکھ ہو گا؟ اور تم ایک ایسی تکلیف محسوس کرو گے' جس سے تمہارا جسم و دل نہ صرف پریشان بلکہ زخمی ہو جائے گا۔ لیکن میں حیران ہوں' کہ یہ جسمانی گمراہی تو تمہیں اذیت کا احساس دلا دیتی ہے' مگر تم صدیوں سے جس بدترین ضلالت میں مبتلا ہو' اور اصلی راہ چھوڑ کر نقلی راستہ اختیار کیے بیٹھے ہو' اس روحانی گمراہی کا احساس تمہیں کیوں نہیں ہوتا؟ اور تم محدثات کا جادہ ضلالت ترک کر کے اس منزل کی طرح کیوں گامزن نہیں ہوتے' جو اللہ نے تمہارے لیے تیار کی ہے؟ اور خدا کے محبوب نبی ﷺ نے جس کی تمہیں راہبری فرمائی ہے۔ دیکھو تم مسلمان ہو' قرآن اور سنت کے حامل مسلمان۔ "کُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ" تمہاری ہی شان میں کہا گیا ہے' تم اسی منزل پر

زندگی بسر کرو اور اسی کی حفاظت کے لیے مر مٹو جس کا اسم گرامی خدا کی زبان میں کتاب و حکمت ہے۔"

اللہ اللہ! کیسی مثالیں ہیں' اور کیسے استعارے! اور یہ کیا؟ آزاد کی بے شمار نگارشات میں ایسی سینکڑوں مثالیں ملتی ہیں' کہ اس عاشق قرآن و سنت نے ہر گام پر پاک و ہند کے مسلمانوں کو بدعات سے روکا' ضلالت سے ٹوکا اور کتاب اللہ و سنت کی اطاعت پر ابھارا ہے' اور اسی کو "حقیقی اسلام" کا نام دیا ہے' خود اپنی ایک تحریر میں فرماتے ہیں:

"لوگ مجھ سے حقیقی اسلام کی تعریف پوچھتے ہیں میں اس کے سوا اور کیا کہوں؟ کہ اللہ کی کتاب اور اس کے نبی کی سنت کا اتباع اور جملہ محدثات و ضلالت سے محترز رہنا اصل اسلام ہے۔" (البلاغ)

بہر کیف کتاب و سنت کے تارکین کو مولانا کی نگارشات کا ہر لفظ دعوت غور و فکر دے رہا ہے' اللہ کریم شرک و بدعت کی دلدل میں پھنسے ہوئے بھائیوں کو سمجھنے کی صلاحیت دے' تاکہ وہ حقیقی منزل کو پانے کے لیے جادہ پیما ہو سکیں۔

تقلید سے نفرت

آزاد مرحوم نے جس گھرانے میں پرورش پائی ہے' اس میں اگرچہ علم و عرفان' سلوک و تصوف' فقر و غنا اور شریعت و طریقت کی جلوہ آرائیاں موجود تھیں' اور بقول مولانا ان کے کانوں میں پانچوں وقت اَللّٰھُمَّ اَحْیِنِي مِسْكِيْنًا وَ اَمِتْنِي مِسْكِيْنًا وَّ احْشُرْنِي فِي زُمْرَةِ الْمَسَاكِيْنِ کی صدائیں آتی تھیں لیکن اس کے ساتھ اس میں پیری مریدی اور تقلید پرستی کا عنصر بھی غالب تھا' ان کے دادا' پردادا کو تو چھوڑیے کہ وہ کیا تھے' اور انھوں نے کیسے سلسلے جاری کیے تھے' ان کے والد مولانا سید خیرالدین احمد کو لیجیے۔ کہ وہ شیخ طریقت اور نامور صوفی و سالک اور عالم و فاضل

بھی تھے' مگر اہل الرائے اور صاحب تقلید تھے' اور اسی عقیدہ کی بنا پر ان کی پیری مریدی کا سلسلہ نہ صرف کلکتہ' بنگال' گجرات کاٹھیاواڑ اور بمبئی وغیرہ تک پھیلا ہوا تھا' بلکہ لنکا' افریقہ اور بعض دوسرے مشرقی ممالک میں بھی ان کے ہزاروں مرید اور معتقد موجود تھے' جن کی بے پناہ آمدنی سے ہروقت ایک خزانہ بھرا رہتا تھا۔

ابوالکلام آزاد کی ولادت و پرورش تعلیم و تربیت بھی اسی تقلید و جمود میں جکڑے ہوئے مقلد گھرانے میں ہوئی' لیکن قدرت بالغہ کے کرشمے کچھ عجیب تر ہوتے ہیں' کہ والد کے اس طریق و مسلک کا ان کے دل و دماغ پر ذرا اثر نہ ہوا۔ اور ہوا تو یہ' کہ جوں جوں لوگ ان کے والد سے عقیدت وارادت تمندی کا اظہار کرتے اور بے جا ادب و احترام میں' جو خاصہ پیری ہے مصروف نظر آتے' آزاد کو ان سے نفرت ہوتی جاتی' اور وہ اس طویل اور گنجلک سلسلہ سے دور رہنا پسند کرتے' اپنی خود نوشت سوانح میں فرماتے ہیں:

"میری پیدائش ایک ایسے خاندان میں ہوئی' جو علم و مشیخت کی بزرگی اور مرجعیت رکھتا تھا' اس لیے خلقت کا ہجوم و احترام جو آج کل سیاسی عروج کا کمال مرتبہ سمجھا جاتا ہے' وہ مجھے عقید تمندیوں کی شکل میں بغیر طلب و سعی کے مل گیا تھا۔ میں نے ابھی ہوش بھی نہیں سنبھالا تھا' کہ لوگ پیر زادہ سمجھ کر میرے ہاتھ پاؤں چومتے تھے' اور ہاتھ باندھ کر سامنے کھڑے رہتے تھے' خاندانی پیشوائی و مشیخت کی اس حالت میں نو عمر طبقوں کے لیے بڑی آزمائش ہوتی ہے' اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ابتدا ہی سے طبیعتیں بر خود غلط ہو جاتی ہیں' اور نسلی غرور اور پیدائشی خود پرستی کا وہی روگ لگ جاتا ہے' جو خاندانی امیرزادوں کی تباہی کا باعث ہوا کرتا ہے' ممکن ہے اس کے کچھ نہ کچھ اثرات میرے حصے میں بھی آئے ہوں' کیونکہ اپنی چوریاں پکڑنے کے لیے خود اپنی کمین میں بیٹھنا آسان نہیں ہے' لیکن میں اپنی حالت کا جائزہ لے سکتا ہوں' مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں' کہ میری طبیعت

کی قدرتی افتاد مجھے بالکل دوسری ہی طرف لے جا رہی تھی' میں خاندانی مریدوں کی ان عقیدتمندانہ پرستاریوں سے خوش نہیں ہوتا تھا' بلکہ طبیعت میں ایک طرح کا انقباض اور توحش رہتا تھا' میں چاہتا تھا کہ کوئی ایسی راہ نکل آئے' کہ اس فضا سے بالکل الگ ہو جاؤں' اور کوئی آدمی میرے ہاتھ پاؤں نہ چومے' لوگ یہ کامیاب جگہ ڈھونڈتے ہیں اور ملتی نہیں مجھے گھر بیٹھے ملی اور اس کا قدر شناس نہ ہو سکا۔ (الجمعیۃ)

دونوں جہاں دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا
یاں آ پڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں؟

گویا یہ مقدمہ تھا ان غیر تقلیدی عقائد کا' جو آگے چل کر اور سیانے ہو کر پختگی اختیار کر گئے' اور مولانا نے سچ مچ تقلید پرستی پر لات مار کر سلسلہ پیری و مریدی کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ دیا۔

اسی پر بس نہیں جب آپ کے والد سید خیرالدین انتقال کر گئے' تو عوام نے آپ کو ان کا جانشین بنانا چاہا' اور لاکھوں مریدان با اخلاص کے ارادتمند ہاتھ آپ کے سامنے بیعت کے لیے دراز ہو گئے' لیکن آزاد ایسی بندشوں سے بالکل آزاد رہنا چاہتے تھے' کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا' معتقدین اصرار کر رہے ہیں' کہ ان کو سجادہ نشینی اور خانقاہی بخشی جائے' اور یہ بھی اپنے بزرگوں کے مزارات کی مجاوری سنبھال کر خزانہ کے مالک بن جائیں' مگر آزاد چونکہ تقلید کی زنجیریں توڑ کر خالص توحید اور توحید والے سے ناطہ جوڑ چکے ہیں' اس لیے نفی میں سر ہلاتے ہیں' اور حجرہ و خانقاہ میں دھرنا مار کر بیٹھنے اور نذروں نیازوں کی ناجائز کمائی کھانے کو اثم عظیم اور جرم کبیر سمجھتے ہیں' لوگوں نے عرض کیا' اور کچھ نہیں تو کم از کم دستار بندی ہو جائے' مگر آزاد اس کو بھی نہیں مانتے' بالآخر کہنے والے ناکام ہو گئے' اور یہ کامیاب' اور کامیاب بھی ایسے کہ آج مشرق اور مغرب کے بچے بچے کی زبان پر ابوالکلام کا نام چڑھا ہے' اور سچ پوچھیے تو دین و ملت کے جو فرائض سرانجام دے کر

وہ اپنا نام اور جو مقام پیدا کر گئے ہیں وہ حجرہ و خانقاہ کا مجاور بننے سے پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ تقلید پرستی کے خلاف اپنی ایک نگارش میں لکھتے ہیں:

"جس حال میں رہے، نقص ناتمامی سے دل کو ہمیشہ گریز رہا، اور شیوۂ تقلید و روشِ عام سے پرہیز۔ جہاں کہیں رہے، اور جس رنگ میں رہے، کبھی دوسرے کے نقشِ قدم کی تلاش نہ ہوئی، اپنی راہ خود ہی نکالی اور دوسروں کے لیے اپنا قدم راہنما چھوڑا۔" (الجمعیتہ)

ایک اور مقام پر تحریر فرماتے ہیں:

"مجھے اچھی طرح یاد ہے، کہ ابھی پندرہ برس سے زیادہ عمر نہیں ہوئی تھی، کہ طبیعت کا سکون ہلنا شروع ہو گیا تھا، اور شک و شبہ کے کانٹے دل میں چبھنے لگے تھے، ایسا محسوس ہوتا تھا، کہ جو آوازیں چاروں طرف سنائی دے رہی ہیں، ان کے علاوہ بھی کچھ اور ہونا چاہیے، اور علم و حقیقت کی دنیا صرف اتنی ہی نہیں ہے، جتنی سامنے آ کھڑی ہوئی ہے، یہ چبھن عمر کے ساتھ برابر بڑھتی گئی، یہاں تک کہ چند برسوں کے اندر عقائد و افکار کی وہ تمام بنیادیں، جو خاندان، تعلیم اور گرد و پیش نے چنی تھیں، بہ یک وقفہ متزلزل ہو گئیں، اور پھر وہ وقت آیا، کہ اس ہلتی ہوئی دیوار کو خود اپنے ہاتھوں سے ڈھا کر اس کی جگہ نئی دیواریں چننی پڑیں۔ ؎

ہیچ گہہ ذوق طلب از جستجو بازم نہ داشت
دانہ مے چیدم دراں روزے کہ خرمن داشتم

آپ نے دیکھا، کہ مولانا نے کس صفائی اور خوب صورتی سے اندھی پیروی اور کورانہ تقلید کے خلاف نبرد آزمائی کی ہے، اور کس اچھوتے انداز میں اپنے غیر مقلد ہونے کا ثبوت دیا ہے، اگر ابھی تسکین نہ ہوئی ہو، تو انہی کے قلم کی چند سطور اور پڑھ لیجیے:

"میری تعلیم خاندان کے موروثی عقائد کے خلاف نہ تھی، کہ اس راہ سے

کوئی کشمکش ہوتی، وہ سرتا سراسی رنگ میں ڈوبی ہوئی تھی، جو مؤثرات نسل اور خاندان نے مہیا کر دیئے تھے، تعلیم نے انہیں اور تیز کرنا چاہا، اور گرد و پیش نے انہیں اور زیادہ سہارے دیئے۔ تاہم یہ کیا بات ہے، کہ شک کا سب سے پہلا کانٹا جو خود بخود دل میں چبھا، وہ اسی تقلید کے خلاف تھا۔ میں نہیں جانتا تھا، کہ کیوں؟ مگر بار بار یہی سوال سامنے ابھرنے لگا تھا، کہ اعتقاد کی بنیاد علم و نظر ہونی چاہیے، تقلید اور توارث پر کیوں ہو؟ یہ گویا دیوار کی بنیادی اینٹوں کا ہل جانا تھا، کیونکہ موروثی اور روایتی عقائد کی پوری دیوار صرف تقلید ہی کی بنیادوں پر استوار ہوتی ہے، جب بنیاد ہل گئی تو پھر دیوار کب کھڑی رہ سکتی تھی؟ کچھ دنوں تک درماندگیاں سہارا دیتی رہیں، لیکن بہت جلد معلوم ہو گیا، کہ اب کوئی سہارا بھی اس گرتی ہوئی دیوار کو سنبھال نہیں سکتا۔"

ازاں کہ پیروی خلق گمرہی آرد!
نمی رویم بہ راہے کہ کارواں رفتہ است

(غبار خاطر)

آگے چل کر اپنی غیر مقلدانہ روش کے بارے میں لکھتے ہیں:

"شک کی یہی چبھن تھی، جو تمام آنے والے یقینوں کے لیے دلیل راہ بنی، بلاشبہ اس نے پچھلے سرمایوں سے تہی دست کر دیا تھا، مگر نئے سرمایوں کے حصول کی لگن بھی لگا دی تھی، اور بالآخر اسی کی راہنمائی تھی، جس نے یقین اور طمانیت کی منزل مقصود تک پہنچا دیا۔ عام حالات میں مذہب انسان کو اس کے خاندانی ورثہ کے ساتھ ملتا ہے اور مجھے بھی ملا، لیکن میں موروثی عقائد پر قانع نہ رہ سکا، میری پیاس اس سے زیادہ نکلی جتنی سیرابی وہ دے سکتے تھے۔ مجھے پرانی راہوں سے نکل کر خود اپنی نئی راہیں ڈھونڈنی پڑیں۔ زندگی کے ابھی پندرہ برس بھی پوری طرح نہیں ہوئے تھے کہ

طبیعت نئی خلشوں اور نئی جستجوؤں سے آشنا ہو گئی تھی' اور موروثی عقائد جس شکل و صورت میں سامنے آ کھڑے ہوئے تھے ان پر مطمئن ہونے سے انکار کرنے لگی تھی۔ البتہ جو عقیدہ کھویا وہ تقلیدی تھا اور جو عقیدہ اب پایا وہ تحقیقی تھا۔" (غبار خاطر)

آپ کی اس تحریر سے ظاہر ہوتا ہے' کہ آپ نے وہ صراط مستقیم پالیا' اور اس حقیقی منزل میں ہمیشہ کے لیے قیام فرمالیا' جو اللہ تعالیٰ نے تمام دنیا کے سامنے اسلام کے سنگ میل کے طور پر پیش کی تھی' یعنی قرآن اور سنت! اس کی تفصیل آپ کو کسی دوسری جگہ ملے گی' یہاں دیکھنا صرف یہ ہے' کہ قدرت کاملہ نے کم عمری میں ہی آپ کی کس طرح راہنمائی فرمائی اور آپ مَا اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَاءَ نَا کے موروثی مقلدانہ عقائد کو ترک کر کے قرآن و حدیث کے سچے اطاعت گذار بن گئے۔ فالحمدللّٰہ!

اتباع کتاب و سنت

اغیار کی متابعت' کورانہ تقلید اور پیری و پیر پرستی کی زنجیریں توڑنے اور موروثی عقائد سے منہ موڑنے کے بعد یہ لازمی تھا' کہ آزاد رحمۃ اللہ علیہ منزل مقصود کو پانے کے لیے کوئی ایسا جادہ عمل اختیار فرماتے' جس پر گامزن ہونے سے دینی اور دنیوی کامرانیاں بڑھ کر آگے آئیں' اور حضرت خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرح ان کی زبان سے اِنِّي وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّ مَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ کا فلک بوس نعرہ لگواتیں۔ چنانچہ یہی ہوا' آباؤ و اجداد کے رسوم و معتقدات سے قطع تعلق کرنے کے بعد اب ایک ہی راہ راست ان کے سامنے تھے جس کو قرآن کی زبان میں صراط مستقیم کہا گیا ہے' اور جس پر چلنے کی آرزو نہ صرف عامۃ المسلمین کے دل میں چٹکیاں لیتی رہی' بلکہ خاصان الٰہی بھی اس کی تمنا

میں دن میں کم از کم پانچ مرتبہ رب العالمین کے دربار میں حاضر ہو کر دست دعاء دراز کرتے رہے۔

ظاہر ہے' کہ صراط مستقیم سے مراد اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت ہے' جب آزاد نے ہر قبلۂ کج سے منہ موڑ کر اپنا رخ اسی ذات اقدس کی طرف کر لیا' جس نے ہر مسلمان کلمہ گو کو اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ کا حکم دیا' اور جس نے اس کی ذرہ بھر خلاف ورزی کرنے والوں کو بہت سی ہیبت ناک وعیدیں سنائی ہیں' تو اب کتاب و سنت کے اتباع اور اللہ اور رسول کی اطاعت میں کون سی رکاوٹ ہو سکتی تھی؟ اب ہوا یہ اور صرف یہ کہ آزاد کو اللہ اور رسول کا سچا عشق لگ گیا اور وہ دن رات اسی لگن میں مگن رہنے لگے' اور یہ لگن عشق کی حد تک بڑھ گئی۔ چنانچہ آپ اس انعام خداوندی اور اپنے اس عشق کی نسبت "الہلال" میں کس خوب صورتی سے لکھتے ہیں ملاحظہ فرمایئے:

> "عقائد و اعمال' عادات و خصائل' فکر و نظر' طرز و روش' کسی بھی بات میں اپنی شگفتگی و خستگی نہ کسی ہاتھ کی ممنون ہے' نہ کسی زبان کی' نہ کسی خاندان کی' نہ تعلیم و تربیت کی' جو کچھ پایا ہے صرف بارگاہ عشق سے پایا ہے۔ جتنی رہنمائیاں ملیں' اسی مرشد فیض و ہادی طریق سے علم کا دروازہ اسی نے کھولا' عمل کی حقیقت اسی نے بتائی' معرفت کے صحیفے اسی کی زبان پر تھے' حقیقت کے خزانے اسی کے دست کرم میں تھے' شریعت کے حقائق کا وہی معلم تھا' طریقت کے نشیب و فراز میں وہی رہبر تھا' قرآن کریم کے بھید اسی نے بتائے' سنت کے اسرار اسی نے کھولے' نظر اسی نے دی' دل اسی نے بخشا' کتنی ہی دلدلوں سے پاؤں نکالے' کتنی ہی جھاڑیوں میں دامن سنبھالا' کتنی ہی زنجیریں توڑنی پڑیں' امیدوں اور امنگوں کے کتنے ہی دفتر خود اپنے ہاتھوں جلانے پڑے' تب کہیں جا کر اس کوچہ میں دم لے سکے' جہاں آج اپنے کو پا رہے ہیں۔ الحمد للہ' کہ میں اپنی

آراء و معتقدات میں کسی انسانی صحبت سے مستفید نہیں' بلکہ صرف ہادی حقیقی کی ہدایت بخشیوں سے کامیاب فیضان ہوں جس کی توفیق کا نور مبین' تاریکیوں میں مشعل راہ اور گمراہیوں میں دست ہدایت ہے۔"

بس اللہ اور نبی کا عشق جنوں خیز آپ کو لگتا تھا' کہ کتاب اللہ کے بحر بیکراں کی غواصی میں مشغول ہو گئے' اور سنت رسول اللہ ﷺ پر اپنے ہر عمل کی بنیاد رکھ دی' گو آپ قرآن و حدیث کے معانی و مطالب پہلے بھی خوب سمجھتے تھے' لیکن اب آیات اللہ اور احادیث رسول اللہ ﷺ کا آپ پر انشراح صدر ہو گیا۔ اور آپ نے آیات و احادیث کو ایک گونہ تکیہ کلام بنا لیا' اور اپنی ہر تقریر و تحریر میں' اپنی ہر نشست و برخاست میں اپنے ہر قول و عمل میں گفتۂ خدا اور فرمودۂ مصطفیٰ ﷺ کا سہارا لینے لگے' اور کہنا یوں درست ہو گا' کہ قرآن و حدیث کے تفحصانہ اور گہرے مطالعہ نے ہی آپ کو تقلید کا طوق اتارنے اور صرف کتاب و سنت کی متابعت کرنے پر مجبور کیا' اور انہیں وحیین (یعنی قرآن و حدیث) کے جذب و اثر کے تحت آپ موروثی مقلدانہ عقائد سے برگشتہ ہو گئے آپ نے کھل کر توحید و سنت کے پرچم کو بلند کیا' و ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشآء۔

اب دیکھیے کہ مولانا کتاب و سنت کے اتباع و پیروی کی تلقین کس انداز سے فرماتے ہیں' ترجمان القرآن میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

"جو کوئی اللہ سے محبت رکھنے کا دعوٰی دار ہے تو اسے چاہیے کہ اللہ کے رسول ﷺ کی پیروی کرے' اللہ کی محبت کا دعوٰی اور اس کی راہ بتلانے والے (یعنی حضرت محمد رسول اللہ ﷺ) کی پیروی سے انکار' ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتے۔"

سبحان اللہ! چند ہی لفظوں میں منکرین حدیث اور تارکین سنت کے رخساروں پر وہ چپت لگائی ہے' کہ بچارے بلبلا ہی تو اٹھے ہوں گے غور کا مقام ہے' کہ جو لوگ نظر بظاہر کتاب اللہ کی لگن رکھتے ہیں' اور نظریہ ظاہر قرآن قرآن کی

رٹ لگاتے رہتے ہیں' اگر وہ حضور نبی کریم ﷺ کے عشق و محبت سے خالی ہیں' اور حضور کی حدیث و سنت پر ایمان نہیں رکھتے' یا رکھتے ہیں تو اس پر عمل نہیں کرتے ان کا خدا سے بھی کوئی تعلق نہیں' وہ اللہ کے باغی ہیں' اور قرآن حمید کے نافرمان و سرکش۔ جیسا کہ مَنْ اَطَاعَنِی فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ وَ مَنْ عَصَانِی فَقَدْ عَصَی اللّٰہَ۔ کے ارشاد نبوی سے ظاہر ہے۔

ایک بار مولانا نے "اصل دین" کے موضوع پر تقریر فرمائی' اس میں اہل اسلام سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

"مسلمانوں کے لیے اصل دین یہ ہے' کہ اللہ کی اطاعت کریں' اللہ کے رسول کی اطاعت کریں' اور جو لوگ ان (مسلمانوں) میں سے صاحب حکم و اختیار ہوں ان کی اطاعت کریں اس حکم سے معلوم ہوا' کہ مسلمانوں کو اپنے تمام مذہبی اختلافات کے لیے قرآن و سنت کی طرف رجوع کرنا چاہیے' نہ کہ انسانوں کے اقوال و آراء کی طرف۔" (الجمعیتہ آزاد نمبر)

مولانا آزاد کی مذکورہ تقریر کے ایک ایک لفظ پر توجہ کیجیے' کہ حضرت مرحوم کس قدر زور دے رہے ہیں مسلمانوں پر' قرآن کے حوالے دے دے کر' کہ صرف اللہ اور اس کے رسول کی پیروی کرو' کتاب و سنت کے احکام پر سر جھکاؤ' اور کسی ایرے غیرے کے قول و قیاس کو دل و دماغ میں جگہ نہ دو' بلکہ اللہ جل شانہ اور محمد ﷺ کے سوا کسی بھی انسان کی رائے اور اجتہاد' استدلال اور استشہاد کو تسلیم نہ کرو' ایک دفعہ ارشاد فرمایا:

"جو لوگ خدائے تعالیٰ کا نام ورد زبان رکھتے ہیں اور اکثر اوقات "اللہ اللہ" پکارتے رہتے ہیں' مگر رسول اللہ ﷺ اور آپ کی سنت شریفہ سے عشق (یعنی والہانہ محبت) نہیں رکھتے' وہ نہ تو قرآن کو سمجھتے ہیں' نہ خدا کی ہستی اور حقیقت کو پا سکتے ہیں' نہ اسلام سے ان کا کچھ لگاؤ ہے' وہ مذہب میں رہ کر مسلمان کہلانے کی ایک رسم پوری کرتے ہیں' اور ان کی اس

مذہبی رسم اور دنیوی رسم میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ (رسالہ البلاغ)

مطلب صاف ہے' کہ جو لوگ مسلمان کہلاتے ہوئے بھی قرآن کریم اور حدیث و سنت سے تعامل نہیں رکھتے' اور زبان سے اللہ اللہ کا ورد کرتے رہتے اور اللہ کی محبت جتاتے رہتے ہیں وہ اللہ سے مذاق کرتے ہیں' اور وہ اس وقت تک پکے اور سچے مسلمان نہیں ہو سکتے جب تک اللہ کی کتاب اور رسول اللہ ﷺ کی سنت پر پورا پورا عمل نہ کریں' اور اس میں صدق و خلوص اور عشق و وارفتگی نہ دکھائیں۔

اسی طرح ایک اور موقع پر ارشاد فرماتے ہیں:

"میں کم تعلیم یافتہ اور ناخواندہ طبقہ کے مسلمانوں پر اتنا متحیر اور متاسف نہیں ہوں' مگر ان مسلمانوں پر تو مجھے رہ رہ کر افسوس آتا ہے' جو قرآن کو معنی سے پڑھتے ہیں اس کا ترجمہ جانتے ہیں اور پھر ان آیات پر غور نہیں کرتے' جن میں مبرہن (صاف اور واضح) الفاظ میں اللہ نے کہہ دیا ہے' کہ رسول کی اطاعت کے بغیر نہ ایمان کی تکمیل ہو سکتی ہے نہ نجات و شفاعت ہو سکتی ہے جو مسلمان اس لباس میں اپنے آپ کو دیکھنا چاہتا ہے' جس لباس میں صحابہ و تابعین تھے' اس کو کتاب اللہ کے علاوہ سنت رسول اللہ ﷺ پر بھی عمل کرنا ہو گا' خدا کے علاوہ رسول سے بھی لو لگانا پڑے گی' ورنہ محض خدا' اسلام اور قرآن پر ایمان لانا بے کار ہو گا' جب ایلچی اور سفیر پر ہی اعتماد نہ کیا جائے تو اس کو بھیجنے والی سلطنت پر کیونکر اعتماد قائم ہو گا؟" (الہلال)

مولانا کی تحریرات کے الفاظ ان کے معتقدات کے خود آئینہ دار ہیں' اور صاف کہے دیتے ہیں' کہ محترم مرحوم ابتدائے عمر میں ہی تقلیدی عقائد سے بیزار ہو کر قرآن و سنت کے متبع ہو گئے تھے' اور پھر آخر دم تک اس پر قائم رہے' نہ صرف خود قائم رہے' بلکہ ہر آن اور ہر گام مسلمانوں کو کتاب و حکمت سے تمسک رکھنے اس کے ہر فرمان اور حکم پر چلنے کی تلقین فرماتے رہے ---- اے کاش! کہ وہ مسلمان'

جو مولانا مرحوم پر حسن عقیدت رکھتا ہے اور ان کی ستائش میں مصروف رہتا ہے' یہ بھی دیکھے کہ مولانا کا مذہبی کردار کیا تھا' اور وہ کس طریق و عمل کو اپناتے تھے' اگر مسلمان کم از کم ان کے بقول اطاعت قرآن و سنت ہی کو چراغ راہ بنالیں' تو "صدقہ جاریہ" کے طور پر ان کی روح پر فتوح کو ثواب پہنچتا رہے گا' اور فائز المرام بھی ہوں گے۔

عشقِ قرآن!

جس خوش قسمت نے مکہ معظمہ جیسی مقدس وادی "غیر ذی زرع" میں جنم لیا ہو' اور جس کی تعلیم خالص اسلامی ماحول میں مذہبی بزرگوں کے زیر نگرانی ہوئی ہو' اس کے نصیبے کا ستارہ اگر قرآن مجید سے والہانہ محبت کی صورت میں نہ چمکتا' تو اور کس طرح نمودار ہوتا؟ پھر وہ قرآن عظیم' جو فولاد کو پانی بنا دیتا ہے' جو پتھر کو موم کر دیتا' اور جو سخت و سنگ پہاڑوں کو خشیت الٰہی سے کپکپا دیتا ہے' کیا یہ ممکن تھا کہ ایک سچے اور قانت مسلمان کے قلب کی گہرائیوں میں اتر کر جذب و اثر اور عشق و محبت پیدا نہ کرتا؟ مس خام کو کندن بنانے والے قرآن نے بھی اپنی کیمیائی صفات سے مولانا آزاد پر جادو کیا' اور وہ اس اکسیر صفت کتاب کی عدیم النظیر ساحریت پر دل و جان سے فدا ہو گئے۔

اب کیا تھا؟ مولانا کو ہمہ وقت اسی کتاب حق کی جلوہ آرائیاں نظر آتی تھیں' اٹھتے' بیٹھتے' سوتے جاگتے اسی کا تصور و تخیل آرام جان تھا' اسی کا ذکر و ورد راحت دل تھا' اسی کی تلاوت و قرأت مجلی چشم و نگاہ اور مزکی قلب و روح تھی' سچ ہے ۔

نہ ہو گر عشق قرآں نور باطن ہو نہیں سکتا
نہ ہو طالع اگر خورشید تو دن ہو نہیں سکتا

﴿ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ تَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ' اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ

الْقُلُوْب ﴾ انہی عاشقانِ خدا و رسول اور فدائیانِ قرآن و حدیث کے حق میں فرمایا گیا ہے، جس کو قرآن پاک سے لگاؤ نہ ہو، اور جس کا دل کلام اللہ کی لگن سے خالی ہو، وہ نہ خدا کو پا سکتا ہے، نہ رسول اللہ کا مقام و مرتبہ سمجھ سکتا ہے، نہ اسلام اور اس کی تعلیمات اور اس کے فلسفیات کا علم رکھ سکتا ہے۔ گویا دین و دنیا کو سمجھنے اس میں کامیاب ہونے، مومن صادق بننے، اور معبود حقیقی سے لو لگانے کے لیے سب سے مقدم یہ ہے کہ وہ کتاب مبین کا شیدا بنے، اللہ نے اپنے کمال فضل و کرم سے مولانا آزاد پر ابر رحمت برسایا اور انہوں نے قرآن کے عشق ہی کی بدولت سب کچھ حاصل کیا، آج اگر مشرق و مغرب میں ان کا نام بلند ہے، تو یہ ساری عزت و عظمت کلام اللہ کی فدائیت کے طفیل ان کو تفویض ہوئی ہے۔

مولانا آزاد کی محبت بالقرآن سے متعلق متعدد قصص و واقعات معروف ہیں جن کا ماحصل یہ ہے، کہ آپ سفر میں ہوتے یا حضر میں، جیل میں ہوتے یا گھر میں رنج میں ہوتے یا راحت میں، بہرصورت و بہرہیئت آپ کی زبان پر آیات قرآنیہ کا ورد ہوتا اور آپ نہایت ترتیل اور وجد آفریں ترنم سے ان کی تلاوت فرما کر حظ و لطف اٹھاتے اور اس طرح اپنی روح و دل کو لذت بخش غذا پہنچاتے۔ قید فرنگ میں آپ کے ایک رفیق زنداں مولانا اسد اللہ خان میرٹھی آپ کی قرآن سے محبت کی نسبت ایک واقعہ یوں لکھتے ہیں:

> "حضرت مولانا کی رہائش گاہ اسپتال کی باؤنڈری میں تھی، اور جیل کے دستور کے خلاف حضرت مولانا کا بنگلہ رات دن میں کسی وقت بھی بند نہ ہوتا تھا، مولانا اکثر رات کے آخری حصے میں چار بجے کے قریب اسپتال میں روزانہ ٹہلا کرتے تھے، اس وقت آپ اکثر عبا پہنا کرتے تھے، یہ ناچیز بھی گیارہ نمبر بارک سے اسپتال میں منتقل کر دیا گیا تھا، اس لیے مولانا کے اس انداز خرام کو روزانہ اسپتال کے اندر دیکھتا تھا، مولانا اس وقت بھی قرآن کریم کی آیات تلاوت فرماتے رہتے تھے، صبح کے سہانے وقت میں

مولانا کا ترنم و لہجہ نہایت ہی دلکش معلوم ہوتا تھا' اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مولانا بے خودی کے عالم میں ہیں اور اسی عالم میں جو کچھ زبان پر آ رہا ہے' مست ہو کر پڑھ رہے ہیں' مولانا تقریباً چار ماہ میرٹھ جیل میں رہے' اس کے بعد آپ کو گونڈا جیل میں بھیج دیا گیا' جب تک آپ میرٹھ جیل میں رہے' آپ کی صبح خیزی و چہل قدمی کا یہ مشغلہ برابر جاری رہا۔" (الجمعیتہ آزاد نمبر)

ذرا جیل کا تصور آنکھوں کے سامنے لایئے' یہ وہ بدترین جگہ ہے' جہاں عام انسان یا تو فرط غم و الم اور عزیزوں کی مفارقت اور اسیری کی تکلیف کی وجہ سے سب طرف سے خیالات ہٹا کر آہ و گریہ میں مصروف رہتے ہیں' یا خدا تک کو فراموش کر کے ایسے مشاغل اختیار کرتے ہیں' جو مذہبی' اخلاقی' اور قانونی طور پر ناروا ہوتے ہیں' مگر آزاد کو دیکھئے کہ جیل میں سڑ رہے ہیں' اور انگریز نے بغاوت کے الزام میں ان کو کڑی سزائیں دے رکھی ہیں' مگر اس حالت میں بھی کلام الٰہی کا عشق بڑھتا اور ابھرتا چلا جا رہا ہے' اور کسی دوسری طرف اپنی نگاہ تخیل پھیرنے کی بجائے صرف مالک حقیقی اور اس کے بھیجے ہوئے کلام ہی سے لو لگاتے ہیں' اور اسی سے جی بہلاتے ہیں' غالباً ﴿ اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰهَ قِیَامًا وَّ قُعُوْدًا وَ عَلٰی جُنُوْبِهِمْ ﴾ ایسے ہی ذاکران الٰہی اور عاشقان فرقان مجید کے حق میں کہا گیا ہے' اور یہی وہ بزرگ ہیں جو ﴿ وَ اذْکُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَ تَبَتَّلْ اِلَیْهِ تَبْتِیْلاً ﴾ کے ایزدی حکم کی تعمیل میں شب و روز لگے رہتے ہیں۔

حکیم محمد الیاس آف کھوڑی کی زبان سے مولانا کی قرآن سے محبت کا ایک اور واقعہ سنئے:

"حضرت امام الہند رحمۃ اللہ علیہ ۱۹۵۱ء میں جب مرکزی دارالعلوم دیوبند تشریف لے گئے' شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی قدس سرہ' حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم' مولانا حکیم سید محمد

اسحاق صاحب کھوڑی رکن مجلس شوریٰ' حضرت علامہ مفتی کفایت اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی معیت میں دارالعلوم کی سیاحت فرمارہے تھے' جب راستہ میں قرأت کی ایک درس گاہ سے گذرے' مولانا کے کان میں قرأت کی آواز پڑی' آپ درس گاہ کی طرف لپکے' اور درس گاہ کے دروازہ پر جاکر چھڑی پر دونوں ہاتھ رکھ کر مؤدبانہ کھڑے ہو گئے' اور بہت خاموشی سے قراءت سنتے رہے' آنکھیں تر تھیں' جب رکوع ختم ہو گیا' تو قاری صاحب نے احتراماً اپنی جگہ سے اٹھنا چاہا' مولانا نے فرمایا' اپنی جگہ پر تشریف رکھیے' اور دوبارہ پڑھیے' چنانچہ کافی دیر تک سنتے رہے' اسی طرح جب باب الظاہر سے فارغ ہو کر نیچے اترنے کے لیے زینہ پر پہنچے' تو حضرت مہتمم صاحب نے بطور معذرت مولانا سے فرمایا' کہ آج آپ کو کافی تکان ہو گئی ہے' مولانا آزاد نے فرمایا' کہ ہاں! مگر میں آپ سے اس کا بدلہ لے لوں گا' اگر آپ میری تکان دور کرنا چاہتے ہیں' تو قرآن شریف کا رکوع سنوا دیجیے۔ چنانچہ باب الظاہر سے اتر کر درس گاہوں کی سیر کراتے ہوئے صدر القراء حضرت مولانا حافظ قاری حفظ الرحمان صاحب کی درس گاہ میں لے جایا گیا' مولانا آزاد کمرے میں داخل ہو کر قاری صاحب کے سامنے بیٹھ گئے' قرأت کی مشق سننے لگے' اثناء درس میں مولانا نے فرمایا' قاری صاحب! ذرا تدریس بند کر کے ایک رکوع سنا دیجیے' قاری صاحب نے سورۂ ملک کا پہلا رکوع شروع کیا' مولانا آزاد کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے' جب رکوع ختم' ہوا مولانا نے فرمایا: ﴿بارک اللہ لنا و لکم فی القرآن الحمید' جزاک اللہ!﴾ (آزاد نمبر)

اللہ اکبر! یہ کیفیت ہوتی ہے' شیدایان قرآن کے پاک قلوب کی' کہ جب وہ خود تلاوت کرتے ہیں یا دوسروں سے قرأت سنتے ہیں' تو اس کی اکسیری تاثیر سے ان پر عجیب قسم کی کیفیت طاری ہوتی ہے اور ان کو اپنے آپ کی شدھ بدھ نہیں رہتی'

مولانا آزاد بھی کلام اللہ کے ایسے ہی عشاق میں سے تھے' کہ جب خود آیات بینات پڑھتے یا کسی سے استماع کرتے' تو ان کا رؤاں رؤاں مسحور و بے خود ہو جاتا' اور بعض دفعہ تو اسی بے خودی کے عالم میں وارفتہ ہو کر اپنے سینے یا سرین پر ہاتھ مارنے اور جھومنے لگتے اور اس کے ساتھ بے اختیار ٹپ ٹپ آنسو بھی گرنے لگتے' مولانا نے اس حالت کا نقشہ ایک دفعہ خود اپنے موقلم سے کھینچا۔ فرمایا:

"خدا جانے وہ کون لوگ ہیں' جو قرآن پڑھتے یا اس کی آیات دوسروں سے سنتے ہیں تو ان کی حالت ایسی ہی نظر آتی ہے' جیسے ان پر کوئی اثر ہوا ہی نہیں' لیکن میں اپنی حالت کیا بتاؤں' قرآن کو نازل کرنے والے کی قسم کھا کر کہتا ہوں' کہ جب میں کلام اللہ کی دو چار آیات پڑھتا یا کسی سے سنتا ہوں' تو بے قرار ہو جاتا ہوں' اور زار و قطار میری آنکھیں آنسو برسانے لگتی ہیں' دل خوف خدا سے کانپ اٹھتا ہے۔ اور جسم نیم جان میں قوت ہی نظر نہیں آتی۔" (البلاغ)

حضرت مولانا کا یہی وہ عشق قرآن تھا' جو چشمہ صافی کی طرح پھوٹ پھوٹ کر ان سے بہتا تھا' اور اس کی سوتیں دوسروں کو بھی سیراب کرتی تھیں' آپ کی یہ قرآنی فدائیت بالآخر' "ترجمان القرآن" کے روپ میں ظاہر ہوئی' جس کی تفصیل دوسری جگہ درج ہے' یہ قرآن ہی کی شیدائیت تھی' کہ آپ اپنی ہر تحریر و تقریر میں آیات مقدسہ کا یوں حوالہ دیئے جاتے تھے' کہ جیسے قرآن آپ کی مادری زبان ہو' اور کلام اللہ شریف پر اس قدر حاوی صرف وہی خوش نصیب ہو سکتا ہے' جس کو اللہ سے حقیقی لگاؤ ہو' اور جو اس کے ایک ایک لفظ پر مرمٹا ہو۔ اَللّٰھُمَّ ارْفَعْ دَرَجَاتَہٗ!

آزاد کا تفقہ فی القرآن والحدیث

جناب رسول اللہ ﷺ نے اپنی ایک حدیث میں ارشاد فرمایا ہے' کہ ﴿ مَنْ یُّرِدِ

اللّٰهُ بِهٖ خَيْرًا يُفَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ ﴾ (صحیحین عن ابی ہریرہؓ) یعنی جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ بھلائی کرنا اور جس کو درست اور نیک رستے پر چلانا چاہتا ہے' اس کو دین کے معاملہ میں فقاہت عطا فرما دیتا ہے' مطلب یہ کہ خداوند تعالیٰ جس شخص کو لائق اور قابل دیکھتا ہے' کہ اس سے مذہب اسلام' اور ملت کو گوناگوں فوائد حاصل ہوں گے' تو اس کو شریعت کے مسائل و احکام کو سمجھنے اور قرآن و حدیث کے ارشادات کے معانی و مطالب جاننے کی سوجھ بوجھ دے دیتا ہے' اور ﴿ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ ﴾ کے دعوائے الٰہی کے مطابق کتاب و حکمت کے اسرار و رموز کو آسانی سے معلوم کر لینے کی صلاحیت اس میں پیدا ہو جاتی ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد بھی ان بزرگوں میں تھے' جن کو خدائے قدوس کی طرف سے قرآن کریم اور حدیث شریف کی فقاہت عطا ہوئی تھی' مولانا کی زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ملتا' جس میں انہوں نے اپنی کسی تحریر و تقریر میں آیات اللہ اور فرمودات رسول اللہ ﷺ سے استدلال نہ فرمایا ہو' قرآنی آیتیں اور حدیث کی روایتیں ایسی صحت کے ساتھ عین موقعہ و محل پر بیان فرماتے' جیسے خاص اسی موقع اور اسی وقت کے لیے خدا اور نبیؐ کی زبان سے نکلی تھیں' اور یہی ان کے تفہیم و تفقہ کا کمال ہے' جو قارئین اور سامعین کو انگشت بدندان کر دیتا تھا' جلسہ ہو رہا ہے کانگریس کا۔ اور مولانا نے اس میں وطنیت و حریت سے متعلق تقریر کرنی ہے' تو وہاں تقریر کے ایک ایک فقرے میں کلام اللہ اور کلام الرسول ﷺ کے حوالے دیئے جا رہے ہیں' اور جو کچھ کہنا ہے' اسے قرآن و حدیث ہی کی رو سے درست اور بجا ثابت کیا جا رہا ہے' آزاد کا قلم چاہے کسی موضوع پر اٹھتا اور ان کی زبان خواہ کسی عنوان پر کھلتی' لیکن اپنی خاص ادا کے ساتھ دوسری دل فریبیاں پیدا کرنے کے علاوہ جب قدم قدم پر آپ کتاب اللہ اور حدیث رسول اللہ ﷺ سے استشہاد کرتے' تو تحریر و تقریر کی لذتوں اور لطافتوں میں کئی گنا اضافہ ہو جاتا' اور لطف یہ کہ آپ کے اس طرز خاص پر مسلمان بھی جھوم جھوم اٹھتے' غیر مسلم بھی وجد و سرور میں مست

ہو ہو جاتے' اور ان کے ایک ایک لفظ کو خراج تحسین پیش کیا جاتا۔

مولانا آزاد کی ایسی فقاہت کے کئی نمونے ان کے سوانح میں ملتے ہیں' مثلاً مرحوم ایک مضمون سپرد قلم کرتے ہیں جس میں آپ نے ایک فاتح اور ایک پیغمبر کا امتیاز دکھاتا ہے' ذرا دیکھیے' کہ آپ اس میں کتاب و حکمت کے کیسے کیسے ناسفتہ موتی پروتے ہیں' لکھتے ہیں:

"ایک فاتح جب ملک گیری کے ارادہ سے میدان جنگ کا رخ کرتا' ہے تو دہل و طبل کے غلغلے اور قرنا و چنگ کے ترانے خیر مقدم بجالاتے ہیں' سر پر پرچم لہراتا ہے' چتر شاہی آفتاب کی شعاعوں کو بھی اس کی طرف نگاہ کرم سے دیکھنے نہیں دیتا' جاہ و جلال کا یہ دیوتا میدان جنگ میں ایک مجسمہ کی طرح کھڑا ہوتا ہے' اور تمام فوج اس مرصع بت کے گرد طواف کرنے لگتی ہے' عظمت و جبروت کا یہ منظر دنیا کو بھی مرعوب کرتا ہے اور خود اس فاتح کا سر بھی بادۂ کبر و نخوت سے لبریز ہو جاتا ہے۔ لیکن ایک پیغمبر کی حالت اس سے بالکل مختلف ہوتی ہے' وہ گھر سے نکلتا' تو (مخلصین و مومنین کی ایک جماعت ساتھ ہوتے ہوئے بھی) اپنا رفیق سفر صرف خدا کو بناتا ہے' اور کہتا ہے ﴿ اَللّٰھُمَّ اَنْتَ الصَّاحِبُ فِی السَّفَرِ وَ الْخَلِیْفَۃُ فِی الْاَھْلِ' اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَعُوْذُبِكَ مِنْ وَّعْثَاءِ السَّفَرِ وَ کَاٰبَۃِ الْمُنْقَلِبِ وَ سُوْءِ الْمَنْظَرِ فِی الْاَھْلِ وَ الْمَالِ ﴾ نبی سواری کی پشت پر قدم رکھتا ہے' تو خدا کا شکر ادا کرتا ہے' ﴿ اَلْحَمْدُلِلّٰہِ الَّذِی سَخَّرَلَنَا ھٰذَا ﴾ وہ سفر سے واپس لوٹتا ہے' تو اپنے خدا کی حمد و ثناء کا ترانہ گاتا ہوا ﴿ اٰیِبُوْنَ تَائِبُوْنَ عَابِدُوْنَ لِرَبِّنَا حَامِدُوْنَ ﴾ کہتا ہوا' پہاڑ کی چوٹیوں پر چڑھتا ہے' اور غلغلہ تکبیر بلند کرتا ہے' تو ترنم ریز تسبیح و تہلیل ہوتا ہے' فوج کو روانہ کرتا ہے تو اس کو نہ غرور و طاقت کی یاد دلاتا ہے' نہ اس کے جوش کو دو آتشہ کرتا ہے' نہ پرانی بہادریوں کے ذکر سے اس کے دلوں کو گرماتا ہے' بلکہ اس کے دین'

اس کی امانت اور اس کے اعمال و نتائج کو خدا کے سپرد کر کے رخصت کرتا ہے ﴿ اَسْتَوْدِعُ اللّٰهَ دِيْنَكُمْ وَ اَمَانَتِكُمْ وَ خَوَاتِيْمَ اَعْمَالِكُمْ ﴾ وہ منزل پر اترتا ہے تو نہ شاہانہ خیمے نصب ہوتے ہیں' نہ فرش و بساط سے زمین آراستہ ہوتی ہے' وہ خدا کا نام لے کر فرش زمین پر ہی لیٹ جاتا ہے اور اپنی حفاظت کی خدمت خود زمین اور اس کے خالق کے سپرد کر دیتا ہے ﴿ يَا اَرْضُ رَبِّيْ وَ رَبُّكِ اللّٰهُ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شَرِّكِ وَ شَرِّمَا فِيْكِ وَ مِنْ شَرِّ مَا يَدُبُّ عَلَيْكِ ﴾ وہ گھر واپس پہنچتا ہے' تو سب سے پہلے مسجد کا رخ کرتا ہے' اور دو رکعت نماز ادا کر کے سجدۂ شکر و رضا بجا لاتا ہے۔ فتح و ظفر کی خبر آتی ہے تو اس کے سامنے شادیانے بجتے ہیں نہ عیش و طرب کے ترانے گائے جاتے ہیں نہ کسی شاہانہ جشن کی تیاری ہوتی ہے۔ اس کی تمام مسرت و جشن ایک سجدۂ شکر ہوتا ہے' میدان جنگ میں دشمنوں کے ہاتھوں شدید زخم لگتا ہے' تو وہ طیش و غضب کا بگولہ بن جانے کی بجائے اپنے اللہ ہی سے رجوع کرتا ہے' اور کہتا ہے' ﴿ رَبِّ اغْفِرْ لِقَوْمِي فَاِنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴾ مختصر یہ کہ ایک فاتح میدان جنگ میں سرپر غرور' مگر ایک پیغمبر جبین نیاز ہوتا ہے' ایک بادشاہ جب زبان خود ستا ہوتا ہے' ان ہی لمحوں میں ایک پیغمبر زبان شکر گذار بن جاتا ہے' میدان جنگ میں ایک بادشاہ غیظ و غضب کا آتش کدہ' مگر ایک داعی حق یہاں بھی رحم و کرم کا سرچشمہ ہوتا ہے۔ چنانچہ تاریخ گواہ ہے' کہ ان دونوں متضاد حالتوں کا انجام بھی نہایت مختلف اور عبرت خیز ہوتا ہے' بادشاہوں کے سرپر غرور بار بار ٹھکرا دیئے گئے' لیکن کسی داعی برحق کی جبین نیاز خاک مذلت سے آلودہ نہ ہوئی' بادشاہوں کی زبان خود ستا بارہا مذلت کے ساتھ خاموش کر دی گئی' لیکن ایک داعی الہٰی کا نغمہ حمد و شکر ہمیشہ دنیا کی فضاؤں میں گونجتا رہا۔ بادشاہوں کے غیظ و غضب کے شعلے بارہا بجھا دیئے گئے مگر انبیاء و

رسل کے دریائے کرم کو دنیا کے خس و خاشاک کبھی روک نہ سکے' ﴿ وَ لَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِ نَا الْمُرْسَلِيْنَ' اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ وَ اِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغَالِبُوْنَ ﴾ (الجمعیتہ آزاد نمبر)

سبحان اللہ! حضرت مرحوم نے کس خوبی و خوش اسلوبی کے ساتھ فاتح اور پیغمبر کا فرق قرآن کریم اور حدیث شریف سے بتایا ہے' کہ زبان قلم چوم لینے کو جی چاہتا ہے' کتاب و حکمت کا یہی وہ تفقہ ہے' جو ایک سچے مسلمان کے قلب و روح کو یُزَکِّیْهِمْ کی بشارت دیتا ہے' اور اس کے میل کچیل کو اپنے فضل سے دھو ڈالتا ہے' ﴿ وَ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ﴾

خط و کتابت ایک عام چیز ہے' جس کو عموماً کوئی اہمیت حاصل نہیں ہے' اور اس میں بالعموم ایسی باتیں ہوتی ہیں' جو دوسروں کے لیے جذب و کشش اور سود و نفع کا موجب نہیں ہوتیں' لیکن مولانا آزاد نے اپنے خطوط میں بھی علم و حکمت کی گوہر فشانی کی ہے' اور اپنی اسی فقاہت قرآن و حدیث کو اس میں بھی خوب درخشاں کیا ہے' آپ کی خط و کتابت کے دو مجموعے زیور طبع سے آراستہ ہو چکے ہیں' اس کے ایک دو نمونے ملاحظہ کیجیے۔

مولانا غلام رسول مہر اپنے ایک مکتوب میں مولانا سے شکایت کرتے ہیں' کہ مدت سے آپ کے ساتھ ملاقات نہیں ہو سکی' اس کے جواب میں مولانا نے تحریر فرمایا:

"ایک حدیث قدسی ہے ﴿ مَنْ تَقَرَّبَ اِلَيَّ شِبْرًا تَقَرَّبْتُ اِلَيْهِ ذِرَاعًا ﴾ جو ایک بالشت میرے قریب آتا ہے میں ایک ہاتھ اس کے قریب جاتا ہوں' عمر بھر میری یہ کوشش رہی ہے' کہ اس وصف کے تعلق سے محروم نہ رہوں۔ اب بھی اس پر عامل ہوں اور عامل رہوں گا۔"

ہزار بار و صد ہزار بار بیا

کیا لطف کی بات ہے کہ ذکر ہو رہا ہے عام ذاتی ملاقات کا' اور پیش کی جاتی

ہے ایک حدیث، جو گویا خاص اسی موقع کے لیے ارشاد فرمائی گئی تھی، اس کا نام ہے فقاہت! ایک صاحب نے اپنی شادی کے متعلق مولانا کو اطلاع دی، اور اس تقریب میں شامل ہونے کے لیے ان سے استدعا کی، مولانا جواب میں لکھتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ اس تقریب کو برکت و سعادت کا موجب بنائے اور تمھاری یہ نئی زندگی ہر اعتبار سے کامیاب ہو، میں اس موقع پر تمھیں یاد دلاؤں گا، کہ بہ حیثیت مسلمان ہونے کے تمھیں چاہیے، ازدواجی زندگی یعنی شادی کی زندگی کا وہ تصور اپنے سامنے رکھو، جو قرآن حکیم نے دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔"

﴿ وَ مِنْ اٰیٰتِهٖۤ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْۤا اِلَیْهَا وَ جَعَلَ بَیْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّ رَحْمَةً اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ ﴾ (الروم:۲۱)

"خدا کی حکمت کی نشانیوں میں ایک نشانی یہ ہے کہ اس نے تمھارے لیے تم ہی میں سے جوڑے پیدا کر دیئے، (یعنی مرد کے لیے عورت اور عورت کے لیے مرد)۔" لیکن خدا نے ایسا کیوں کیا؟ اس لیے کہ تمھاری زندگی میں تین چیزیں پیدا ہو جائیں، جن تین چیزوں کے بغیر تم ایک مطمئن اور خوش حال زندگی حاصل نہیں کر سکتے وہ تین چیزیں یہ ہیں، سکون، مودت اور رحمت، ﴿ لِّتَسْكُنُوْۤا اِلَیْهَا وَ جَعَلَ بَیْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّ رَحْمَةً ﴾ "سکون" عربی میں ٹھہراؤ اور جماؤ کو کہتے ہیں، مطلب یہ ہوا کہ انسان کی طبیعت میں ایسا ٹھہراؤ اور جماؤ پیدا ہو جائے کہ زندگی کی بے چینیاں اور پریشانیاں اسے ہلا نہ سکیں، مودۃ سے مقصود محبت ہے۔ قرآن کہتا ہے، ازدواجی زندگی کی تمام تر بنیاد محبت پر ہے، شوہر بیوی سے، اور بیوی شوہر سے اس لیے رشتہ جوڑتی ہے، تاکہ ان کی ملی جلی زندگی کی ساری تاریکیاں محبت کی روشنی سے منور ہو جائیں۔"

ایک صاحب نے اپنے خط میں مولانا سے استفسار کیا کہ ابن جوزیؒ اور ابن تیمیہؒ ایسے محدثین نے یہ جو صوفیہ پر کڑی تنقیدیں کی ہیں آپ کی رائے میں ان کی کیا حیثیت ہے' جب کہ محدثین میں شاہ ولی اللہ اور ان کے خلفاء سید احمد بریلوی' مولانا عبداللہ غزنوی وغیرہم کو صوفیہ میں شمار کیا جاتا ہے' یہ سوال ذرا طویل تھا' مگر آزاد مرحوم نے چند ہی فقروں میں جامع و مانع جواب تحریر فرمایا اور خوب تحریر فرمایا۔ آپ نے لکھا کہ:

> "تم نے اپنے افکار و عقائد کا جو کچھ حال لکھا ہے' اس سے نہایت خوشی ہوئی' اللہ تعالیٰ علم و عمل اور حق کی مزید توفیق عطا فرمائے۔ ابن جوزی و ابن تیمیہ وغیرہما محدثین نے صوفیہ کے خلاف جو کچھ لکھا ہے' اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہ ہو گا' کہ یہ لوگ صوفیائے کاملین کے مخالف تھے' خود ابن تیمیہؒ نے شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا ذکر بڑے احترام سے کیا ہے' اور ان کے شاگرد ابن قیمؒ نے "منازل السائرین" کی شرح لکھی ہے' آپ نے میرے شخصی تاثرات دریافت کیے ہیں' میں زندگی بھر کی کدوکاوش کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اس راہ میں طمانیت قلب کا مقام بغیر ذوق و حال کے میسر نہیں آتا ﴿ وَ مَنْ لَمْ يَذُقْ لَمْ يَدْرِ ﴾ اگر کوئی امر مانع نہ ہو تو نوافل تہجد کی مداومت کرو۔ فرائض کے علاوہ تمام نمازیں حتیٰ الوسع تنہائی میں پڑھی جائیں اور استحضار قلب کی پوری پوری کوشش کی جائے' کمیت سے زیادہ کیفیت کا لحاظ رکھنا چاہیے' اور اس بات سے افسردہ خاطر نہیں ہونا چاہیے کہ فوراً کشود کار نہیں ہوتا' اگر استقامت کے ساتھ سعی جاری رہی' تو بحکم ﴿ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ﴾ کشود کار یقینی ہے' طلب و سعی کی زندگی بجائے خود اپنے اندر لذت و حلاوت رکھتی ہے' اس سے اپنے آپ کو محروم کیوں رکھیں۔"

دیکھا آپ نے' کہ حضرت موصوف نے تقریر و خطبات اور مقالات علمیہ تو

رہے الگ، اپنے عام خطوط میں بھی کس طرح علم و فقاہت اور بالغ نظری کا مظاہرہ کیا ہے؟

رہی یہ بات، کہ مولانا کو قرآن حکیم اور حدیث شریف کی یہ فقاہت کیسے ملی؟ اور انہوں نے اس کا شرف کمال کیونکر حاصل کیا؟ تو اس کا مختصر سا حال حضرت نے خود ہی تحریر فرمایا ہے، لکھتے ہیں:

"جب کوئی انسان ایک ہی چیز کے تصور و تخیل میں اپنے دل اور دماغ کو وقف کر دیتا ہے، تو اسی چیز کا عکس اور نقشہ ہر لمحہ اس کے سامنے رہنے لگتا اور اس کو ہر آن متاثر کرتا رہتا ہے۔ جو لوگ برائی کا تصور جمائے بیٹھے ہیں انہیں ہر وقت اٹھتے بیٹھتے ہر طرف برائی ہی برائی نظر آتی ہے، اور وہ اس میں اس قدر ماہر کامل ہو جاتے ہیں، کہ شیطانوں کو بھی ان سے پناہ مانگنا پڑتی ہے، اور ان کی شرارت سے بھرپور اسکیمیں ہر جگہ خوف و ہراس پیدا کر دیتی ہیں، مگر جو لوگ نیکی کے تخیل میں محو رہتے ہیں، ان کے پیش نگاہ نیکیوں کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا، اور اسی میں مہارت تامہ حاصل کرتے ہیں، اسی طرح جو انسان قرآن کریم، حدیث نبوی اور دوسرے علوم دینیہ کے تحصیل و تصور میں غلطاں رہے اور انہی کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لے، تو وہ نبی کریم علیہ السلام کے بعد اگرچہ مرتبہ نبوت نہیں پا سکتا، مگر صالحین میں تو ضرور شامل ہو سکتا ہے۔ لیکن قرآن کریم، حدیث رسول اللہ ﷺ اور دیگر علوم دینیہ کے اسرار و نکات اسی پر کھلتے ہیں، اور اسی کو یہ عرفان حاصل ہو سکتا ہے، جس کے قلب مصفیٰ میں ان کا دریائے عشق ہر وقت رواں اور موجزن رہتا ہے، ایسے خوش نصیبوں کے دل کی آنکھیں کھل جاتی ہیں دماغ کی بلندیاں اور اونچی ہو جاتی ہیں، اور ان کا کوئی ثانیہ ایسا نہیں گذرتا جس میں علوم الٰہی اور علوم نبوی کے رموز و معارف ان کو اپنا مستانہ نہیں بنا لیتے، اللہ کا شکر ہے، کہ یہ عاجز بھی اس

قسم کا عشق اپنے اندر رکھتا ہے' اور اسی کی بدولت قرآن فہمی اور حدیث دانی پا سکتا ہے۔" (البلاغ)

مولانا کی اس نگارش سے ثابت ہوا کہ جب تک کسی کے دل میں قرآن حکیم اور حدیث شریف کی محبت' عشق و جنون کے درجہ تک نہ پہنچی ہو' اور جب تک کوئی شخص اسی عشق و وارفتگی میں ہر وقت محویت نہ دکھائے' اس وقت تک قرآن و حدیث کی حقیقی فقاہت (اصلی سمجھ بوجھ) حاصل نہیں ہو سکتی۔ علاوہ بریں اس سے یہ بھی راز کھلا' کہ فقہ کے یہ معنی نہیں ہیں' کہ انسان قیاسی اور ظنی باتوں پر ایمان رکھے اور اپنی رائے اور اپنے اجتہاد کو منظر عام پر لائے' بلکہ یہ معنی ہیں' کہ جو کچھ کہے قرآن و حدیث کی زبان سے کہے' بالفاظ دیگر صحیح فقیہہ وہی ہے' جو ہر بات' ہر مسئلہ اور ہر معاملہ میں قرآن و حدیث کی رہنمائی میں چلتا ہو' کتاب و سنت سے تمسک رکھتا ہو اور دوسروں کے آراء و قیاسات سے سخت محترز رہتا ہو۔

مولانا آزاد کے قرآن و حدیث کا یہ تفقہ و تفہم کوئی مسلمانوں ہی کو حیرت کی انگلیاں نہیں چبواتا تھا' غیر مسلم بھی اس سے ششدر بلکہ بسا اوقات پریشان ہو جاتے تھے۔ یہاں تک کہ آپ کی اس عجیب و غریب فقاہت اور رسوخ فی العلم کے چرچے انگریز کے گھر تک بھی پہنچے اور ہندوستان کی برٹش گورنمنٹ آپ کی قرآن فہمی اور حدیث دانی کو نہ صرف بنظر استعجاب دیکھنے لگی' بلکہ اس سے اس کے ایوانوں میں ایک کھلبلی مچ گئی' برٹش انڈیا کے جی حضوری اور نیم سرکاری انگریزی جرائد مولانا کے اس دینی تبحر کو تشویش ناک نگاہوں سے دیکھنے لگے' اور اپنے ادارتی مضامین میں حکومت برطانیہ کو پر زور مشورے دینے لگے' کہ اس خطرناک شخص کی قرآن دانی اور حدیث فہمی پر کڑی نگرانی رکھی جائے' چنانچہ مدراس میل' ٹائمز آف انڈیا اور پاؤنیٹر ایسے اخبارات نے تو دل کھول کر مولانا کے خلاف لکھا ان میں سے پاؤنیٹر اخبار سب سے پیش پیش تھا' اس نے اپنے ایک اداریہ میں یہاں تک لکھ دیا کہ:

"برطانوی ہند میں ایک شخص ابوالکلام آزاد ہے' جو انڈیا کی برٹش

گورنمنٹ کے لیے دردِ سر بنا ہوا ہے' اور حیرت یہ ہے کہ یہ شخص اب تک آزاد ہے' اور نہایت بے باکی سے اپنے قلم کو تیغ براں کی طرح چلائے جا رہا ہے۔ یہ شخص ہفت روزہ "الہلال" کا ایڈیٹر ہے' جو اپنے باغیانہ مضامین کی ایک ایک سطر میں قرآن اور حدیث کے حوالے دیتا ہے' اور قرآن و حدیث سے ہی انگریز کے خلاف بغاوت کا جواز ثابت کرتا ہے' اس کی تحریروں سے ایسا معلوم ہوتا ہے' کہ قرآن اور حدیث میں ہندوستان' ہندوستانی مسلمانوں بلکہ ساری دنیا کو کامل آزادی دینے دلانے کے ہی مضمون درج ہیں' اور بعض وقت تو ایسا معلوم ہوتا ہے' کہ گویا قرآن اس شخص پر اسی غرض سے اترا ہے' کہ وہ لوگوں کو حکومت کے خلاف مشتعل کرتا اور آزادی پانے کے لیے ابھارتا رہے۔ یہ شخص بلا کا قرآن فہم اور حدیث دان ہے۔ جس کی تحریر کا ہر لفظ گو قرآن یا حدیث کا ترجمہ نہیں ہوتا' لیکن اپنی ہر سطر اور ہر فقرے میں قرآنی آیات اور حدیثیں ایسی خوبی سے درج کرتا ہے' کہ موقع و محل اور سیاق و سباق کے لحاظ سے وہ قرآن و حدیث کا ترجمہ ہی معلوم ہوتی ہیں' برٹش گورنمنٹ یہ سب کچھ دیکھتی ہے اور چپ سادھے ہوئے ہے اور اس کو گرفتار نہیں کرتی ہے۔ ہمارا مشورہ ہے کہ اس شخص پر اور اس کی تحریر کے ایک ایک لفظ پر احتساب کیا جائے' ورنہ کسی وقت یہ قیامت بن کر اس کو تباہ کر دے گا۔ اور ایسا انقلاب لائے گا کہ اس کی پیدا کی ہوئی بغاوت کسی طاقت سے نہ دب سکے گی۔"

الغرض مولانا کا یہ تفقہ دینی حلقوں تک ہی محدود نہ رہا' بلکہ سیاسی حلقوں کو بھی اس نے دیدے پھاڑنے پر مجبور کر دیا' اور حکومت کے محلات میں اس نے محشرستان قائم کر دیا' اس وقت کے وائسرائے لارڈ ریڈنگ نے آپ کی قرآن دانی اور حدیث فہمی کی رپورٹ ایک دفعہ انگلستان بھی بھیجی تھی' اور لکھا تھا' کہ

ہندوستان کے بعض مسلمان علماء تاج برطانیہ کے خلاف جو بغاوت کیے ہوئے ہیں' اس کو اپنی مذہبی کتابوں سے ثابت کرتے ہیں' انہی علماء میں سے ایک مولانا آزاد ہیں' جو سب پر تفوق و برتری رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ جب کبھی مولانا کو گرفتار کر کے عدالت کے کٹہرے میں کھڑا کیا جاتا' تو اس وقت بھی آپ اپنے بیانات میں قرآن کریم اور حدیث نبوی ہی سے استشہاد فرماتے' جس سے حاکم عدالت سخت پریشان ہو جاتا۔ اور حق تو یہ ہے کہ آزاد مرحوم اپنی عالمانہ شان اور دینی فقاہت کی ایک ایسی مثال قوم میں چھوڑ گئے ہیں جس کی اگر پیروی کی جائے' تو مسلم قوم کو کئی قسم کے روحانی جسمانی' انفرادی اور اجتماعی فوائد حاصل ہو سکتے ہیں' باذن اللہ تعالیٰ۔

حدیث سے شیفتگی

مومن صادق اور مسلم قانت کو اپنی دنیوی اور اخروی زندگی نمونہ' فردوس بنانے کے لیے جہاں اللہ تعالیٰ اور اس کے پاک کلام پر ایمان لانا اور اس سے والہانہ محبت رکھنا لازم ہے' وہاں یہ بھی اشد ضروری ہے' کہ اللہ کے مقدس رسول اللہ ﷺ اور حضور ﷺ کے ارشادات گرامی یعنی حدیث و سنت سے گہری محبت رکھی جائے' یعنی فنا فی اللہ اور فنا فی الرسول ہونا لازم ملزوم ہیں' اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ اور قرآن کریم سے عقیدت و پیار رکھتا ہے' لیکن رسول اللہ ﷺ اور ان کے فرمودات سے محبت کا اظہار نہیں کرتا تو اللہ اور قرآن پر اس کی محبت کا اظہار کرنا بیکار اور عبث ہے۔ کلام اللہ میں ایک مرتبہ نہیں متعدد مرتبہ اس اہم نکتے کو دہرایا گیا ہے ﴿ وَ مَنْ یُّطِعِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ --- اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ اور وَ مَا اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ﴾ ایسی آیات مبارکہ میں واضح طور پر کہا گیا ہے' کہ جب تک رسول اللہ ﷺ اور ان کی سنت سے نہایت گہرا تعلق نہ رکھو گے' اس وقت تک نہ تمہاری شفاعت ہو سکے گی نہ نجات۔ اور نہ کوئی اچھے سے اچھا عمل قبولیت پا

سکے گا۔

مولانا ابوالکلام آزاد ان بزرگوں میں تھے' جنھوں نے اس راز کو پایا اور بہت خوبی سے پایا' اور قرآنی احکام کو سمجھ کر حدیث رسول اللہ ﷺ سے پریت لگائی وہ محب قرآن تو تھے ہی' مگر اس محبت میں ان کو یہ راہنمائی بھی نصیب ہو گئی کہ یہ محبت اور والہیت اس وقت تک تکمیل کو نہیں پہنچ سکتی جب تک حدیث و سنت سے دلی پیار پیدا نہ ہو' پس انہوں نے کتاب حق کے ساتھ ساتھ حدیث شریف سے بھی الفت لگائی' اور ان دونوں وحیوں کو ایمان و انقیاد اور عقیدت و محبت کے درجہ میں برابر برابر رکھا۔ ہم مولانا کے اتباع کتاب و سنت کے سلسلے میں ان کی تحریر کا یہ اقتباس درج کر چکے ہیں:

> "جو کوئی اللہ سے محبت کا دعوے دار ہے' تو اسے چاہیے' اللہ کے رسول کی پیروی کرے' اللہ کی محبت کا دعویٰ اور اس کی راہ بتلانے والے کی پیروی سے انکار ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتے۔ مسلمانوں کے لیے اصلی دین یہ ہے کہ اللہ کی اطاعت کریں اور اللہ کے رسول کی اطاعت کریں اور جو لوگ ان میں سے صاحب حکم و اختیار ہوں ان کی اطاعت کریں۔ اس حکم سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کو اپنے تمام مذہبی اختلافات کے لیے قرآن و سنت کی طرف رجوع کرنا چاہیے نہ کہ انسانوں کے اقوال و آراء کی طرف۔" (ماخوذ از ترجمان القرآن)

اپنی اس نگارش میں انہوں نے صاف الفاظ میں بتا دیا ہے' کہ اللہ سے محبت رکھنے والے اور اللہ کے رسول سے دور رہنے والے ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے' اور اپنے ایمان کو مکمل نہیں کر سکتے' جیسے کہ آج کل منکرین حدیث کی روش ہے' کہ بظاہر کتاب اللہ پر فریفتہ نظر آتے ہیں' اور اللہ تعالیٰ کے شیدائی دکھائی دیتے ہیں' لیکن اس کے ساتھ ہی رسول اللہ ﷺ اور حضور کی حدیث و سنت سے نہ صرف انکار کرتے ہیں' بلکہ سخت ترین عداوت رکھتے ہیں اور ارشاد نبوی ﴿ وَ مَنْ عَصَانِي

فَقَدْ عَصَى اللّٰهَ ﴾ کی زد میں آتے ہیں۔

مولانا مرحوم یہ کبھی برداشت نہ کرتے تھے' کہ ایک شخص مسلمان کہلائے' اور پھر وہ حدیث سے محبت نہ رکھے اور سنت کی اطاعت نہ کرے۔ آپ ان مسلمانوں کو حیرت و تاسف کی نگاہ سے دیکھتے تھے جو ہیں تو مسلمان' لیکن یا تو حدیث و سنت کے منکر ہیں یا تارک۔ ایک بار لاہور کے ایک جلسہ میں فرمایا کہ:

"اگر آج بھی مسلمان من حیث الاجتماع کتاب اللہ اور حدیث رسول اللہ کو حرز جان بنالیں' اور ان دونوں پر خلوص نیت اور صدق دل سے عمل کرنے کا عہد کرلیں' تو نہ صرف ان کی غلامی اور کمتری کی زنجیریں کٹ جائیں' بلکہ ساری دنیا کی سلطنتیں ان کے قدم چومنے میں فخر محسوس کریں اور ان کی زندگی پر ملائکہ بھی رشک کرنے لگیں۔" (حمایت اسلام)

اسی طرح ایک دفعہ کلکتہ میں ایک عظیم الشان اسلامی اجتماع ہوا جس میں مختلف خیال و عقیدہ کے مسلمان شریک ہوئے اس وقت مولانا آزاد نے مسلمانوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔"

"میں تم سے اور کچھ کہنا نہیں چاہتا' صرف یہ بتا دینا چاہتا ہوں' کہ اگر دنیا اور آخرت کی زندگی میں کامیاب و کامگار ہونا چاہتے ہو' تو مادی طاقتوں کا خوف دل سے نکال دو' اور صرف اللہ سے ڈرتے رہو' اللہ اور رسول سے عشق لگاؤ یعنی سچی محبت' قرآن اور حدیث کی لگن پیدا کرو' کہ کامرانی کا یہی سیدھا اور صحیح راستہ ہے۔" (الہلال)

اب ذرا مولانا کی ایک اور تحریر دیکھیے---- ایک بار کسی مجلس میں نزول مسیح علیہ السلام' کے متعلق آپ سے مسئلہ پوچھا گیا' اور اسی سلسلے میں یہ بھی استفسار ہوا' کہ حدیث و سنت کے بارے میں آپ کیا رائے رکھتے ہیں؟ مولانا آزاد نے اس کے جواب میں فرمایا:

"آپ پوچھتے ہیں' کہ احادیث کے بارے میں میرا کیا عقیدہ ہے؟ میں اس

کا آپ کو کیا جواب دوں؟ یہ سوال آپ اس شخص سے کر رہے ہیں' جو اپنی تحریرات میں نہ صرف حدیث کو حجت اور واجب العمل ثابت کر چکا ہے بلکہ جس کو اس فہم کی توفیق ملی ہے کہ ﴿ وَ یُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَ الْحِكْمَةَ ﴾ میں "حکمت" سے مقصود "سنت" ہے۔ اور جس نے جابجا مقدامؓ کی روایت سے استدلال کیا ہے کہ ﴿ اَلَا اِنِّی اُوْتِیْتُ الْقُرْاٰنَ وَ مِثْلَهٗ مَعَهٗ۔ یُوْشَكُ رَجُلٌ شَبْعَانٌ عَلٰی اَرِیْكَتِهٖ یَقُوْلُ عَلَیْكُم بِهٰذَا الْقُرْاٰنَ فَمَا وَ جَدْتُّمْ فِیْهِ مِنْ حَلَالٍ فَاَحِلُّوْهُ وَ مَا وَ جَدْتُّمْ فِیْهِ مِنْ حَرَامٍ فَحَرِّمُوْهُ ﴾ اتنا ہی نہیں' بلکہ جس کی تمام قلمی جد و جہد یکسر دعوت اتباع کتاب و سنت پر مبنی رہی ہے' اور جس کے عقیدہ میں کتاب کا ہر وہ اتباع' اتباع ہی نہیں جو سنت کے اتباع سے خالی ہو۔

"ایں دو شمع اند کہ ازیک دگر افروختہ اند"

مولانا کی اس تحریر کو پڑھ کر غور کرنا چاہیے' کہ سچی محبت اس کا نام نہیں' کہ انسان کسی سے محبت لگائے' تو پھر محبوب کی پرواہ ہی نہ کرے اور اس کی کسی بات کی طرف متوجہ نہ ہو' سچی محبت یہ ہے کہ محبوب کی ہر ادا سے لطف اٹھایا جائے' اس کے ہر ایک حکم کی فوراً تعمیل کی جائے' اور کسی چون و چرا اور حیل و حجت کے بغیر اس کی ہر بات پر سر تسلیم خم کیا جائے' جو بزرگوار اللہ تعالیٰ اور اس کے حبیب پاک پر جان و دل سے فدا ہوتے ہیں' وہ اپنی فدائیت کا اظہار یوں کرتے ہیں' کہ ان کے مقدس کلام کے ایک ایک لفظ کو فرط محبت سے پڑھتے' اس کے معانی سمجھ کر قلب و روح میں جذب و اثر لیتے اور خلوص نیت سے ایک ایک ارشاد کی تعمیل میں لگ جاتے ہیں۔ مگر جو لوگ محض اوپری اور ظاہری محبت رکھتے ہیں' ان کے دلوں میں کھوٹ ہوتا ہے' وہ زبان سے تو اللہ اور رسول اللہ ﷺ کے سوکھے اور بے معنی نعرے لگاتے ہیں' مگر اللہ اور رسول ﷺ جو حکم دیتے ہیں' سر تسلیم اس پر خم نہیں کرتے۔ جس بات سے منع کرتے ہیں' اس سے نہیں رکتے۔ جو کام کرنے کو کہتے ہیں

اس پر تیار نہیں ہوتے' اس کا نام عشق یعنی سچا پیار نہیں مذاق ہے' یہ محبت نہیں تمسخر ہے' جیسا کہ خود مولانا نے ایک جگہ لکھا ہے۔ اور خوب لکھا ہے:

"نیتوں میں فتور ہو' اور دل خلوص و الفت سے خالی ہوں' تو خدا اور نبی کریم ﷺ کے اہم ترین احکام پر عمل کرنے میں بھی کئی قسم کی رکاوٹیں نظر آتی ہیں' اور قرآن و حدیث کی تعلیمات پر توجہ کرنے کو دل ہی نہیں چاہتا' اسلام میں اسی بے عملی کا نام ترک سنت ہے' جو ترقی کر کے انکار کے درجہ تک پہنچ جاتا ہے' اور ریاکارانہ معاشقہ کا پردہ چاک کر دیتا ہے' اللہ اور رسول ﷺ سے اس قسم کا ٹھٹھا کرنے والوں کی نسبت میں اس سے زیادہ اور کیا کہوں' کہ یہ عاقبت ناآشنا لوگ ایک دن دربار الٰہی میں پیش کیے جانے والے ہیں' اس وقت اربوں عبرت خیز آنکھیں ان کا انجام دیکھ لیں گی۔" (البلاغ)

پھر ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں:

"سنت رسول اللہ ﷺ کا اتباع ہی وہ حقیقی عشق اور سچا پیار ہے' جو ان کی ذات سے کسی میں پایا جاتا ہے' اور یہی وہ اطاعت ہے جس کا قرآن میں کئی جگہ حکم آیا ہے' اور جس کی احادیث میں وضاحت ملتی ہے۔ اطاعت کے بغیر عشق ناکام ہے' اور عاشق نامراد۔ اس کے علاوہ جو لوگ کسی حکم کی اطاعت کرتے وقت اس پر اعتراض کرنے لگتے ہیں' کہ یہ حکم یوں کیوں دیا گیا ہے' وہ بھی فداکاری کے مرتبہ تک نہیں پہنچ پاتے۔" (الہلال)

مولانا کی یہ نگارشات خود ان کے اعلیٰ کردار کی مظہر ہیں' اور وہ یہی ہے' کہ جہاں آپ اللہ تعالیٰ اور اس کے مقدس کلام کے سچے دلدادہ تھے' وہاں آپ رسول اللہ ﷺ اور حضور ﷺ کے ارشادات مبارکہ کے بھی شیدائے صادق تھے' اور کتاب و سنت کی محبت و اطاعت ہی کو حقیقی اسلام سمجھتے تھے۔

بحث و مناظرہ!

اس میں کلام نہیں' کہ مولانا ابوالکلام کو سیاسی انہماک اور تالیفی و تصنیفی مصروفیات کی وجہ سے مذہبی مناظرات کا بہت کم موقع ملا' لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ کلکتہ اور بمبئی وغیرہ کے زمانہ قیام میں غیر مسلموں کے ساتھ ان کی بحثیں ہوتی رہتی تھیں' اور یہ مباحثے کبھی ترقی کر کے باقاعدہ مناظروں کی شکل اختیار کر لیتے تھے' یوں بھی ہمیں آپ کے حالات پر غور کرنا ہے' کہ جب آپ قرآن اور حدیث پر عبور کامل رکھتے تھے' اور جب آیہ کریمہ ﴿ يَدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ﴾ ہر آن آپ کے پیش نگاہ رہتی تھی' تو آپ یہ کیسے گوارا کر سکتے تھے' کہ کوئی دین خدا کا مخالف و معاند' اسلام اور اس کی تعلیمات پر لغو اعتراضات اور رکیک حملے کرے اور آپ خاموش پڑے رہیں؟ اور اپنی زبان کو حرکت میں نہ لائیں؟ دشمنان دین حضور سرکار دو عالم ﷺ کی شان اقدس میں گستاخی کریں' اور آزاد چپ سادھے بیٹھے رہیں؟ ایسا ہو نہیں سکتا۔ بلکہ جہاں اور جب ضرورت ہوتی مولانا میدان مباحثہ میں کود پڑتے اور اپنی قوت مناظرہ سے مخالف کے ایسے چھکے چھڑاتے کہ اسے راہ فرار اختیار کرتے ہی بنتی' اور وہ آپ کے دلائل ساطع اور براہین قاطع کا جواب دینا تو کجا' ایک لمحہ بھی آپ کے سامنے ٹھہر نہ سکتا۔

کلکتہ میں جب آپ "الہلال" کی زمام ادارت سنبھالے ہوئے تھے' ان دنوں تین ہندو دفتر میں آپ کے پاس آئے' اور دوزخ و جنت' عذاب و ثواب' قیامت اور آخرت' بعث بعد الموت اور ایسے ہی دوسرے مسائل پر جو ان کے نزدیک "خلاف عقل و قیاس" تھے' مولانا کے ساتھ بحث شروع کر دی۔ اور ساتھ ہی یہ شرط بھی لگا دی' کہ معقولات سے جواب دینا ہو گا' منقولات کو تسلیم نہ کیا جائے گا' اور کسی اسلامی کتاب کا حوالہ قابل قبول نہ ہو گا۔ مگر اللہ کے فضل سے مولانا نے چند

ہی منٹوں میں انہیں پریشان کر دیا' اور وہ بحث کیا کرتے؟ بغلیں جھانکنے' سر کھجلانے اور زمین کریدنے لگے اور سوچنے لگے' کہ کوئی ایسا بہانہ ہاتھ آ جائے' جس سے بھاگ نکلیں' اور آخر وہ بھاگ ہی گئے۔

اسی طرح ایک دفعہ دو برہمنوں کو آپ نے سربازار شکست دی' اور ان کے دانت کھٹے ہی نہیں کیے' توڑ کر رکھ دیئے۔

عیسائیوں کو تو آپ بری طرح لیتے تھے' اگر کسی وقت کوئی بد قسمت مسیحی آپ سے الجھ جاتا' اور کوئی اعتراض کر بیٹھتا' تو آپ کی تیغ زبان اس کو کاٹ کر رکھ دیتی' اور وہ آپ کے برہان اور آپ کے جواب سے پناہ مانگنے لگتا' اس قسم کے حالات پاک و ہند کے متعدد جرائد و رسائل میں آ چکے ہیں' نمونہ کے طور پر اخبار "الجمعیتہ" دہلی کے ایک ادارتی مقالے کی چند سطور ملاحظہ کیجیے:

> "بہت کم لوگوں کو معلوم ہو گا' کہ آزاد مرحوم نے بمبئی کے قیام میں چو پاٹی پر سمندر کے کنارے عیسائی مشنریوں سے تقریری مناظرے کیے' نصرانیت پر اسلام کی حجت تمام کی' ناقوس پر اذان کو غلبہ دلایا' صلیب پر ہلال کو آویزاں کیا' اور کلیسا پر مسجد کی اہمیت واضح کی' افسوس ہے کہ اس دور کے حالات تاریکی میں ہیں' صرف اتنا معلوم ہے کہ جب پادریوں کو آزاد کی گرفت سے پناہ نہ مل سکی تو انہوں نے گورنر سے فریاد کی اور گورنر نے نصرانی بیڑہ کی حفاظت کے لیے اپنے خصوصی اختیارات سے کام لیا' نہ معلوم اس کے بعد مولانا آزاد کے مقابلہ کی کیا صورت رہی اور کن حالات میں آپ نے بمبئی کو خیرباد کہا۔" (آزاد نمبر)

بہرکیف' ان حالات سے یہ بخوبی واضح ہوتا ہے' کہ مولانا آزاد فن مناظرہ میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے' اور اپنے تبحر علمی سے اس میں بھی کمال پیدا کیا تھا' اور اس میں ہمیں چنداں حیران ہونے کی بھی کوئی ضرورت نہیں' جس آزاد نے سیاسی میدان میں بڑے بڑے مغربی مدبروں کو ہرا دیا' اور اپنے اعتراضات سے انہیں گھٹنوں میں

سر دبانے پر مجبور کر دیا' وہ آزاد مذہبی میدان میں کسی کو کیوں غالب و فتح مند ہونے دیتا؟ اس نے ﴿ وَ تَوَاصَوا بِالْحَق ﴾ کا حق ادا کیا' اور شیر کی طرح گرج کر باطل کی لومڑیوں کی جانیں ہوا کر دیں' اس نے حق و صداقت کے نعرے لگائے' اور ان نعروں سے کفار و مشرکین کے دلوں کی حرکتیں بند ہو گئیں۔ اور دنیا پر ثابت کر دیا' کہ آزاد صرف سیاسی لیڈر ہی نہیں' ایک بہادر اور جری مناظر بھی ہے' جس کی زبان کی کاٹ تلوار سے بھی شدید تر ہے' اور اس کے مجروحین کا بچنا محال ہوتا ہے' اللہ تعالیٰ اسلام کے اس نڈر جرنیل پر لاکھوں رحمتیں نازل فرمائے۔ آمین

اعلائے کلمتہ الحق

جب ہم مولانا آزاد کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیتے ہیں' تو جہاں ان کو اور بہت سی صفات سے متصف پاتے ہیں' وہاں ہمیں یہ بھی صاف نظر آتا ہے' کہ مرحوم سچائی کے پیکر اور صدق و صفا کے مظہر تھے' اور کسی عنوان حق و صداقت کو چھپانا اور کذب و ریاکاری کو کام میں لانا برداشت نہ کرتے تھے' جس بات میں کوئی حقیقت اور اصلیت نہ ہوتی' اسے زبان پر لانا تو درکنار سننا بھی پسند نہ کرتے تھے۔

آپ نے ایک بار نہیں' متعدد بار ملت اسلامیہ کو حق کا پرستار بننے اور باطل سے محترز رہنے کی تلقین فرمائی ہے' اور اس کو اس جادۂ حق پر چلانے کی کوشش کی ہے' جسے خدائے قدوس نے پسند کیا ہے۔ ایک بار حق و صداقت کا پیغام دیتے ہوئے اپنی ایک تحریر میں فرمایا:

> "دعوت و اعلان حق کا کام کرنے والوں کو اپنے لیے نہیں' مگر اپنے کام کی عزت کی خاطر بادشاہوں کی سی نظر اور کشور ستانوں کا سا دماغ رکھنا چاہیے' جو لوگ خدا کے دروازے کے سائل ہیں' دنیا میں کس کی ہستی ہے کہ وہ انہیں اپنے سامنے سائل دیکھ سکے۔ ان کی جیب میں ایک کھوٹا سکہ بھی نہ

ہو' لیکن ان کے دل میں وہ خزانہ (حق و صداقت) مخفی ہے جس سے بڑے بڑے مغرور بادشاہوں کو خرید سکتے ہیں۔" (الہلال۔ کلکتہ)

مولانا کے حالات شاہد ہیں' کہ انہوں نے زندگی میں کبھی وہ بات نہیں کہی' جو بے حقیقت' بے دلیل اور بودی و پھسپھسی ہو۔ جو کچھ ان کے دل میں ہوتا اور جو کچھ ان کا ضمیر کہتا وہی کچھ زبان پر لاتے' اور کلمۃ الحق کے اعلاء و اظہار میں کبھی تامل نہ کرتے' انہوں نے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور پاؤں میں بیڑیاں پہن لیں' گلے میں طوق گرانبار لٹکا لیا' عدالتوں میں گھسیٹے گئے' جیل کی کال کوٹھڑیوں میں برسوں بند رہنا گوارا کیا' لیکن رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد مبارک کو کبھی فراموش نہ کیا' کہ ---- "جابر سلطان کے سامنے کلمہ حق کہنا ہی سچی دلاوری و جوانمردی ہے۔"

اپنی اسی حق گوئی کی عادت کی نسبت ارقام فرماتے ہیں:

"میں نے ہمیشہ اپنی فریادیں بلند کی ہیں' اور ہمیشہ وہ سب کچھ تم کو بتلا دینا چاہا ہے' جو میرے دل نے مجھے بتایا' میں تم سے سچ سچ کہتا ہوں' کہ میں نے کبھی نصیحت کرنے میں خیانت نہیں کی' اور نہ کسی مادی عقوبت کا خوف میرے دل کو ڈرا سکا' نہ ذاتی نفع و فوائد کا لالچ مجھے رام کر سکا' میرے آگے دنیوی عزت کے حصول اور دولت و جاہ سے مالا مال ہونے کی بے شمار راہیں کھلیں' مگر خدا نے میرے دل کو ہمیشہ اپنی مقدس انگلیوں میں اس طرح رکھا کہ اس کے جلال و عظمت کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں نے اپنے کسی ذاتی فائدے کی خاطر کبھی راہ حق سے رائی بھر انحراف گوارا نہ کیا۔"

مولانا کی حق پرستی' صداقت پسندی اور جرأت و بیباکی کا ثبوت اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتا ہے' کہ جنوری ۱۹۲۲ء میں ان پر انگریزی حکومت سے بغاوت کے "الزام" میں پریذیڈنسی جیل علی پور کلکتہ میں جو تاریخی مقدمہ چلایا گیا' اور جس میں عام طور پر یہ شبہ کیا جا رہا تھا' کہ ممکن ہے انڈین برٹش گورنمنٹ ان کو پھانسی پر

چڑھا دے' یا گولی سے اڑا دے' اس نازک وقت میں بھی انہوں نے جابر مجسٹریٹ کے سامنے اعلان حقیقت سے گریز نہ کیا' اور اسلام کے آئین کی رو سے اپنے بیان میں گرج کر کہا کہ موجودہ (انگریز) گورنمنٹ ظالم ہے' لیکن اگر میں یہ نہ کہوں تو اور کیا کہوں؟ مجھ سے یہ توقع کی جائے کہ ایک چیز کو اس کے اصلی نام سے نہ پکاروں؟ میں سیاہ کو سفید کہنے سے انکار کرتا ہوں' ایسی ملفوظ صداقت جو اس سے کم ہو میرے علم میں نہیں' اور میرا یہ اعتقاد اس لیے ہے کہ میں مسلمان ہوں۔ اسی پر موقوف نہیں' بھارت کے جن ہندو لیڈروں کو مولانا کا دلی دوست سمجھا جا رہا ہے' مولانا نے ان کی "دوستی" کی خاطر کسی بھی اخفا و ریاکاری سے کام نہیں لیا' گاندھی اور نہرو کی جو باتیں وہ پسند نہ کرتے' انہیں صاف صاف آشکارا کر دیتے' اور حق کو چھپانا ہر حالت میں گناہ عظیم سمجھتے۔ سوچنا چاہئے کہ جو شخص ﴿ لاتلبسوا الحق بالباطل ﴾ کی لطیف تریں تفسیریں کرتا ہو' اس کے دل میں حق و صداقت کے سوا کوئی دوسری چیز کیونکر گھر بنا سکتی تھی؟

ترجمان القرآن

مولانا ابوالکلام آزاد کے اسلوب بیان کی دلکشیاں' اور ان کے انداز نگارش کی دلفریبیاں محتاج توضیح نہیں' مرحوم کی سحربیانی کی طرح ان کی جادو نگاری بھی دلوں پر طلسم پھونکتی تھی' اور ایک قاری مسحور ہو کر رہ جاتا تھا۔

اگرچہ سیاسیات میں شبانہ روز مشغول رہنے کے باعث مولانا تصنیف و تالیف پر زیادہ توجہ نہ دے سکے اور پولیٹیکل امور نے ان کے قلم کو بڑی حد تک روکے رکھا' تاہم انہوں نے جو کچھ اور جتنا کچھ لکھا' وہ بھی آب حیات کا ایک ذخیرہ ہے' جو ملت اسلامیہ کو تازہ زندگی کا ساغر پلاتا ہے' مولانا کے مصنفات میں مندرجہ ذیل تصنیفات خاصی شہرت حاصل کر چکی ہیں:

(۱) الحرب فی القرآن (۲) حقیقت الصلوٰۃ (۳) حقیقت الزکوٰۃ (۴) حقیقت الصوم (۵) حقیقت الحج (۶) حجت ابراہیمی (۷) ولادت باسعادت (۸) مقام دعوت (۹) مسلمان عورت (۱۰) خطبہ احیاء ملت (۱۱) مسئلہ خلافت (۱۲) شہیدِ اعظم (۱۳) اتحاد اسلامی (۱۴) اولیاء اللہ و اولیاء الشیطان (۱۵) خون شہادت کے دو قطرے (۱۶) انسانیت موت کے دروازے پر (۱۷) افسانہ ہجر و وصال (۱۸) سرمد شہید (۱۹) کاروان خیال (۲۰) غبار خاطر (۲۱) تذکرہ (۲۲) خود نوشت داستان حیات یعنی ہندوستان نے آزادی جیت لی (۲۳) برہان و بصائر (۲۴) ترجمان القرآن وغیرہ۔ علاوہ بریں بعض کتابیں سیاسیات سے تعلق رکھتی ہیں، لیکن افسوس ہے، کہ ان کی متعدد قیمتی کتب نہ تو زیور طبع سے آراستہ ہو سکیں اور نہ محفوظ ہی رہ سکیں۔

اگرچہ آپ کی تمام مؤلفات نور علیٰ نور ہیں، لیکن "ترجمان القرآن" تو ایک ایسا شاہکار ہے، جسے ان کی سب نگارشات کا بادشاہ کہنا چاہیے، اس لیے بھی کہ یہ اللہ تعالیٰ کے کلام پاک کی تفسیر ہے، اور اس لیے بھی، کہ اس میں علم و عرفان کے جوہر دکھائے گئے، اور حکمت و موعظمت کے موتی پروئے گئے ہیں، مولانا کی عدیم الفرصتی گو اس کو پایہ تکمیل تک نہیں پہنچا سکی، اور یہ بے نظیر تفسیر ۱۸ پاروں پر جا کر رک گئی، جس قدر لکھی گئی، خوب لکھی گئی، اور اس درجہ قبول عام پا گئی، کہ مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلموں نے بھی اس کو جھوم جھوم کر پڑھا اس کا کچھ نہ کچھ اثر قبول کیا، اور اس پر بہت اچھے شذرات لکھے۔ اور بہت عمدہ ریمارکس دیئے۔

آر، وینکٹ راؤ سیکرٹری ہندوستانی ہندی سبھا، حیدر آباد دکن نے لکھا:

"مولانا صاحب کیسے مسلمان تھے، اور ان کا اسلام کیا تھا؟ اسے سمجھنے کے لیے "ترجمان القرآن" پڑھا جائے، امن و صلح کل ان کے اسلام کا لب لباب تھا، ہندوستان کی جنگ آزادی میں کود پڑے، اس لیے کہ وہ خوب جانتے تھے، کہ دنیا میں جب تک سامراج شاہی کا دور دورہ رہے گا، تب تک انسان انسان میں فرق بنا رہے گا، قرآن کا ترجمہ لکھا، بنی نوع انسان کے درمیان بھائی چارہ بڑھانے کے لیے!

پنڈت گوپی چند امن صدر تعلقات عامہ کمیٹی دہلی نے لکھا:

"ترجمان القرآن" ایک مذہبی کتاب ہے' جو نہ صرف مولانا کی مذہبی واقفیت کی وسعت اور گہرائی کا پتہ دیتی ہے بلکہ ان کی ہمہ گیری اور بالغ نظری کی بھی دلیل ہے۔"

مولانا نے یہ تفسیر جیل کی کوٹھڑیوں میں ہی زیادہ تر لکھی ہے' آزاد رہ کر اس کی طرف سے دھیان دینے کا انہیں بہت کم موقع ملا ہے۔ مولانا نے سب سے پہلے قرآن حکیم کی ایک تفسیر "برھان و بصائر" کے نام سے قلم بند فرمائی تھی' لیکن جب سی آئی ڈی آپ کے کاغذات کی پے درپے تلاشیاں لینے لگی' تو اس تفسیر کا مسودہ بھی انہی تلاشیوں کی نذر ہو گیا' اور اس کا ایک ورق بھی دستیاب نہ ہو سکا۔ کہا جاتا ہے' کہ "برہان و بصائر" نام کی تفسیر ایک حد تک مکمل ہو چکی تھی' لیکن اس کے ضائع ہونے یا خفیہ پولیس کے اٹھا لے جانے کے بعد آپ نے "ترجمان القرآن" لکھنا شروع کی۔ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ "برہان و بصائر" کی تفسیر زیادہ واضح مشرح اور طویل تھی' مگر ترجمان القرآن کو اس سے مختصر کر دیا گیا' یہ تفسیر آپ نے زیادہ تر ٹیگورولا رانچی کی نظربندی میں اور سنٹرل جیل میرٹھ میں تحریر فرمائی' خصوصاً اس کی دوسری جلد تو میرٹھ جیل ہی میں مکمل کی' مولانا کے اپنے بیان کے مطابق تفسیر "ترجمان القرآن" ستائیس برس سے بھی زیادہ عرصہ میں لکھی گئی۔ اور جس قلبی ذوق و شوق' جس روحانی حظ و لطف اور جس دیدہ ریزی اور جان فشانی سے لکھی گئی اس کے متعلق فرماتے ہیں:

"کامل ستائیس برس سے قرآن میرے شب و روز کے فکر و نظر کا موضوع رہا ہے اور اس کی ایک ایک سورۃ ایک ایک مقام ایک ایک آیت' ایک ایک لفظ نے وادیاں قطع کی ہیں' اور مرحلوں پر مرحلے طے کئے ہیں' تفاسیر و کتب کا جتنا مطبوعہ و غیر مطبوعہ ذخیرہ موجود ہے' میں کہہ سکتا ہوں کہ اس کا بڑا حصہ میری نظر سے گذر چکا ہے' اور علوم قرآن کے مباحث و

مقالات کا کوئی گوشہ نہیں، جس کی طرف سے ذہن نے تغافل اور جستجو نے تساہل کیا ہو، علم و نظر کی راہوں میں آج کل جدید و قدیم قسم کی تقسیمیں کی جاتی ہیں، لیکن میرے لیے یہ تقسیم بھی کوئی تقسیم نہیں، جو کچھ قدیم ہے وہ مجھے ورثہ میں ملا اور جو کچھ جدید ہے، اس کے لیے اپنی راہیں آپ نکال لیں، میرے لیے وقت کی جدید راہیں بھی ویسی ہی دیکھی بھالی ہیں، جس طرح قدیم راہوں کے چپہ چپہ کا شناسا ہوں۔" (دیباچہ ترجمان القرآن)

یہ تفسیر کیوں مقبول ہوئی؟ اور اس قدر حسن و خوبی اور جاذبیت سے کیونکر لکھی گئی؟ اس کا مختصر جواب یہ اور صرف یہ ہے کہ مولانا آزاد ازبسکہ مسلکاً" اہل حدیث تھے اور قرآن و سنت سے تمسک رکھتے اور اسی سے استنباط فرماتے تھے، اس لیے ہر عقل سلیم نے آپ کے تحریر کردہ بیان القرآن کو تسلیم کیا، اور اس کو پڑھ کر دلوں میں وجدانی کیفیتیں پیدا ہوئیں اگر آپ نے اس اپنی تفسیر کو قرآن و سنت کے ماتحت نہ رکھا ہوتا، اور محض قیاسی ظنی، اجتہادی مطالب کو صفحہ قرطاس پر پھیلا دیا ہوتا، جیسی کہ اہل الرائے اور اہل القیاس حضرات کی تفسیریں ہوتی ہیں، تو پھر آپ کی تفسیر بھی ایک محدود دائرے میں پھنس کر رہ جاتی، اور اس چکر میں گرفتار ہو جاتی، جس میں مبتلا ہونے سے خود قرآن و حدیث نے منع کیا ہے:

ترجمان القرآن کی قبولیت کا اندازہ اسی سے لگایا جا سکتا ہے، کہ جب اس کا پہلا حصہ "تفسیر سورۂ فاتحہ" کے نام سے نکلا ہے، تو عوام نے اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا، اور ام الکتاب کی اس ادیبانہ تفسیر نے طالب علموں اور عالموں میں ایک تہلکہ مچا دیا، لوگ اسے بار بار پڑھتے تھے اور سیر نہ ہوتے تھے، اور ہر مرتبہ ایک نیا لطف ایک نیا ذوق، ایک نیا حظ اٹھاتے تھے، مطلب یہ ہے، کہ آپ کی تفسیر ترجمان القرآن ایک بے عدیل تفسیر ہے، جس میں ایک طرف علم و حکمت کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے، اور دوسری طرف شعر و ادب کی رنگینیاں اہل ذوق کو مستانہ بنا رہی ہیں، خود خیال

فرمائیے، کہ قلم ہو ابو الکلام آزاد کا، اور پھر وہ شرف قبولیت نہ پا سکے؟ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے؟

تفسیر ترجمان القرآن ہی اس امر پر شاہد ہے، کہ مولانا آزاد کو کتاب اللہ کے رموز و اسرار سمجھنے کا کس قدر ملکہ تھا، اور آپ اس کے نکات و معارف پر کتنا عبور اور کس قدر دستگاہ کامل رکھتے تھے۔

ہمارے سامنے آپ کے تبحر قرآنی کی ایک مثال اور بھی ہے، اور وہ یہ ہے، کہ جن دنوں مولانا شبلی نعمانی مرحوم، "سیرۃ النبی" کی تالیف میں مصروف تھے، تو آزاد نے بھی اس کا مسودہ دیکھا۔ کچھ تامل کے بعد مولانا شبلی سے فرمایا۔ کیا اچھا ہوتا کہ آپ رسول اکرم ﷺ کی سیرت مبارکہ قرآن کریم ہی سے لکھتے اور اس حدیث پر نظر رکھتے جو حضرت عائشہؓ سے مروی ہے، کہ ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے کسی صحابی نے آنحضرت ﷺ کی سیرت کی نسبت پوچھا تو صدیقہ محترمہؓ نے فوراً جواب دیا۔ کیا تم قرآن نہیں پڑھتے؟ كَانَ خُلُقُهُ الْقُرْاٰن یعنی قرآن کریم میں نبی کریم ﷺ کی مکمل سیرت ہے۔

لیکن مولانا شبلی نے معذوری ظاہری کی، اور فرمایا، کہ میں حضور کی سیرت کو قرآن سے مکمل نہیں کر سکتا، یہ جواب پا کر مولانا آزاد نے اپنے راہوار قلم کو حرکت دی، اور طرز خاص سے "قرآن اور سیرۃ محمدیہ" کے نام سے ایک مکمل سیرت لکھ دی، جس میں ابتداء سے آخر تک تمام حالات اور پھر مفصل حالات قرآن کریم ہی سے مستنبط و منضبط کیے، یہ تھا مولانا آزاد کا قرآن پر عبور۔ کہ جب کسی بحر ذخار کی غواصی فرماتے تو ایسے ایسے گراں بہا اور نایاب جواہرات چن چن کر لاتے، جس کی نظیر ملنا محال ہوتی۔

جب ایسے ایسے ادق اور پیچیدہ موضوعات کو آپ نے قرآن کریم سے منطبق کر کے دنیا کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا ہے، تو ایک تفسیر کا مرتب کرنا ان کے لیے کون سا مشکل کام تھا۔

ہاں! تفسیر ترجمان القرآن کا خاص الخاص پہلو ایک یہ بھی ہے' کہ قرآن کریم میں جہاں جہاں اطاعت رسول اور اتباع سنت سے متعلق احکام آئے ہیں' مولانا نے دل کھول کر ان کی شرح فرمائی ہے' اور بدلائل قاطعہ اس بات پر زور دیا ہے' کہ ایک مسلمان کی مسلمانی اسی صورت میں قائم رہ سکتی ہے' اور اس کا ایمان و ایقان اسی صورت میں صحیح و سالم رہ سکتا ہے' جب کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی سیرت و سنت کی پیروی کرے' اور دوسروں کے آراء و افکار قیاسات و اجتہادات سے یکسر محترز رہے' اگر ایسا نہ کیا جائے گا' تو اسلام اور قرآن کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا چنانچہ ﴿ فَلَا وَ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ (۲) اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَاللّٰهِ الْاِسْلَامُ (۳) اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ (۴) اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ﴾ ایسی آیات بینات کی تفسیر ترجمان القرآن میں پڑھیے۔ انشاء اللہ آنکھیں کھل جائیں گی' اور منکرین حدیث و سنت تو گھٹنوں میں سر دبا لیں گے۔

تبلیغ و اشاعت دین

مولانا آزاد کی نگارشات کو بنگاہ تفحص اگر دیکھا جائے تو یوں معلوم ہوتا ہے' کہ وہ بجائے خود ایک رنگین اور مرصع' تبلیغی مرقع ہیں' جس میں دین حنیف کے بو قلموں مجلّٰی نگینے کچھ اس طرح سجائے گئے ہیں' کہ زبان مسلم بے ساختہ مرحبا پکار اٹھتی ہے' لیکن اگر آپ کی ٹھوس اسلامی تبلیغ و اشاعت دیکھنا ہو' تو اس کا قیمتی ذخیرہ بھی آزاد کی تحریروں اور تقریروں میں بمقدار وافر موجود ہے' خیال کیجیے' جس شخص کے سامنے ﴿ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ﴾ ایسے ارشادات خداوندی جلوہ فرما ہوں اور جو شخص ﴿ وَ لْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ﴾ ایسی آیات ہم آہنگ کو روزانہ تلاوت کر کے اس کا اثر قبول کرتا ہو' وہ اللہ کے دین

کی تبلیغ و اشاعت سے کیوں غافل رہتا؟ عوام کو رشد و ہدایت کی راہیں کیوں نہ دکھاتا' ان کو برائیوں سے کیوں نہ روکتا؟ اور انہیں اعمال حسنہ پر کیوں مائل نہ کرتا' اور غیر مسلموں کو اسلام کی دعوت کیوں نہ دیتا؟ آزاد کی کتاب زندگی کے ایک ایک حرف کا مطالعہ کیا جائے' تو یہ معلوم ہوتے دیر نہ لگے گی' کہ اس بہادر سپاہی نے جہاں غلامی اور جبر و استبداد کے خلاف جہاد کیا ہے' اور اپنی زبان کو تیر و نشتر اور اپنے قلم کو شمشیر خارا شگاف بنا کر چلایا ہے' وہاں اس کی مجاہدانہ سرگرمیاں تبلیغ دین کے لیے بھی کچھ کم نہیں رہیں' اس کی مذہبی تصنیفات خود اس پر شاہد ہیں' جو کتاب بھی سپرد قلم کی ہے' عام طور پر اس کا مقصد تبلیغی فکری اور اصلاحی ہی رہا ہے۔

جیل کی کال کوٹھڑیوں میں دعوت و تبلیغ

آزاد کی تبلیغی سرگرمیوں کا اندازہ اسی سے کیا جا سکتا ہے' کہ جب انہیں زندان کے ظلمت کدوں میں بند کر دیا جاتا تھا' تو اس وقت بھی وہ دین اسلام کے تبلیغی اور اشاعتی فرائض کو نظرانداز نہ کرتے تھے۔ وہ قید فرنگ کے مصائب میں مبتلا تھے' نظربندی کے دکھ جھیل رہے تھے' مگر اس حال میں بھی توحید و رسالت کے احیاء و ابلاغ کا کام بخوبی کیے جاتے تھے' جب آپ ۱۹۱۶ء سے ۱۹۲۰ء تک ٹیگورولا رانچی میں قید رکھے گئے تو اس وقت بھی آپ مسلمان قیدیوں کو درس قرآن دیا کرتے تھے' اور ساتھ ہی ساتھ تفسیر کی تدوین بھی فرماتے رہتے تھے۔ پھر اسی جیل میں غیر مسلم اسیروں کو اسلام کی خوبیاں بتاتے اور انہیں باطل کو ترک کرنے اور حق کو قبول کرنے کی دعوت دیتے رہتے۔

اہل حدیث اجتماعات میں شرکت

قارئین یہ تو معلوم کر چکے ہیں' کہ مولانا ابوالکلام آزاد علیہ الرحمۃ خالص

اہل حدیث تھے' اور نو عمری میں اپنے والد کے سامنے ہی تقلید و بدعت کی زنجیریں توڑ کر موحد' غیر مقلد اور محض مسلک قرآن و سنت کے پیرو بن گئے تھے' پس اسی عقیدۂ راسخہ کے ماتحت اب آپ اہل حدیث جماعت کے جلسوں اور اجتماعوں میں بھی شرکت فرمانے اور تبلیغی تقریریں کرنے لگے' ایک دفعہ کلکتہ میں منعقد ہونے والی اہل حدیث کانفرنس میں شریک ہوئے جس کی صدارت شیخ الاسلام فاتح قادیان مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ نے فرمائی' اس میں آپ نے تبلیغ اور اس کی ضرورت و اہمیت پر ایسی فاضلانہ تقریر کی' کہ عوام تو عوام' علماء تک عش عش کر اٹھے' اسی کانفرنس میں آپ نے مبلغین اسلام کے تبلیغی جمود اور اشاعتی تغافل کو دیکھ کر ان سے یوں خطاب کیا:

"یہ کتابوں کے پلندے اور کتب خانوں کی الماریاں (علماء) جو ہمارے سامنے ہیں' یہ بھی نہیں جانتیں' کہ تبلیغ خارجی کسے کہتے ہیں' اور تبلیغ داخلی کس کا نام ہے۔؟" (الجمعیتہ)

دراصل آپ یہ چاہتے تھے کہ تبلیغی دائرۂ کار کو صرف جلسوں اور کانفرنسوں تک محدود نہ رکھا جائے بلکہ اسے باقاعدہ پلاننگ کے تحت شرق تا غرب پھیلایا جائے۔ کیونکہ قرآن و سنت کسی خاص شہر یا علاقے کے لئے نہیں بلکہ پوری کائنات کے لئے ہے قرآن و سنت کے دائرہ کو تنگ نہیں وسیع کرنا چاہئے۔ اور خوب محنت سے کام لے کر انہیں دو قندیلوں کی راہنمائی میں فکر و نظر کی تاریکیوں کو اجالے میں بدلنے کی کوشش کرنی چاہئے۔

داخلی اور خارجی تبلیغ

ان دونوں قسم کی تبلیغوں کا مطلب واقعی بہت کم لوگ سمجھتے ہیں' اور وہ یہ ہے کہ جب اپنے ہی ہم قوموں اور ہم مذہبوں کو خلاف شرع اعمال سے روکا جاتا ہے

اور ان کو قرآن و سنت کے احکام پر چلنے کی تلقین کی جاتی ہے تو یہ داخلی تبلیغ کہلاتی ہے' لیکن جب غیر مسلم اقوام کو قرآن و سنت کا پیغام سنایا جاتا ہے اور ان کو راہ حق اختیار کرنے کی دعوت دی جاتی ہے' تو اس کا نام خارجی تبلیغ ہے۔ مولانا آزاد علماء و مبلغین پر یہ زور دیتے تھے' کہ وہ داخلی اور خارجی دونوں طرح کی تبلیغ کرتے رہیں تاکہ دین الٰہی کا منشاء و مقصد بدرجہ اتم پورا ہو' مسلمانوں سے بدعت و ضلالت کا استیصال ہو' اور کفار و مشرکین اسلامی تعلیمات سے متاثر ہو کر دین حنیف کی طرف جھک پڑیں' یہ صرف زبانی جمع خرچ نہیں تھا' بلکہ مولانا خود بھی بسا اوقات اس پر کار بند ہوتے تھے' اور جلسوں اور اجتماعوں میں دونوں قسم کی تبلیغ فرماتے تھے' مولانا اکثر اوقات سورہ والعصر کی تفسیر بیان فرمایا کرتے اور وہ بھی متواتر ڈیڑھ ڈیڑھ دو دو گھنٹے۔ اور ارشاد فرماتے کہ اگر بالفرض پورا قرآن نازل نہ ہوتا اور یہی ایک سورۃ والعصر نازل ہو جاتی تو رشد و ہدایت اور تبلیغ و اشاعت کے لیے کافی تھی۔ اور یہ قول امام شافعی وغیرہ کا بھی ہے۔ مطلب اس قول کا یہ ہے کہ سورۂ والعصر میں اسلامی تعلیمات کا خلاصہ بیان کر دیا گیا ہے۔ جو ہماری فلاح و ہدایت کے لئے بہت کافی ہے۔

غیر مسلم تحریکات کا انسداد

مولانا ایک جگہ لکھتے ہیں۔ اگر ایک مدعی اسلام میں صدق مقال نہیں' تو اسلام میں سے اس کے پاس کوئی چیز بھی نہیں' ﴿ وَلَيْسَ وَرَآءَ ذَالِكَ مِنَ الْإِيْمَانِ حَبَّةُ خَرْدَلٍ ﴾

اسی اسلامی دعویٰ کی بنا پر آپ سچ کہنے اور حق کو ظاہر کرنے میں ذرا تامل نہ فرماتے۔ آپ حق و صداقت کے علمبردار تھے' اور دولت سرمدی آپ کو اس جامع و اکمل دین نے بخشی تھی جو تمام مذاہب و ادیان کی سچائیوں کا مجموعہ ہے' اسی اسلام نے آپ کو جرأت مندی بھی عطا فرمائی اور آپ دشمن دین پر ایک شیر کی طرح حملہ

کرتے اور اس طرح کرتے کہ اس کا بچ کر جانا محال ہو جاتا۔

ہم مناظرات کے بیان میں لکھ چکے ہیں' کہ عیسائی مشنریوں سے آپ کی جھڑپیں اکثر ہوا کرتی تھیں' اور چوپاٹی (بمبئی) میں تو آپ نے ان اعدائے اسلام کو کچھ ایسی بری طرح گھائل کیا' کہ ان کو برٹش حکومت کا دروازہ کھٹکھٹانا اور ان سے فریاد کرنا پڑی' یہاں تک کہ ان کی تبلیغی سرگرمیوں کو سرکاری ہتھیاروں سے روک دیا گیا۔

اب ہمارے سامنے ایک اور بڑی اہم بات آتی ہے' اور وہ یہ ہے' کہ عام لوگ سمجھتے ہیں' کہ مولانا آزاد ازبسکہ کانگریسی تھے' اور کانگریس کے صدر تھے' اور ہندو مسلم اتحاد کے زبردست حامی تھے' اس لیے ہندوستان میں جب ہندوؤں کی ہندوانہ تحریکات پرپرزے نکالتیں اور وہ مسلم آزاری پر کمربستہ ہو کر اہل اسلام کو مذہبی اور قومی نقصان پہنچانا چاہتیں تو مولانا آزاد "ہندو مسلم اتحاد" کی خاطر اور ہندو لیڈروں کے لحاظ سے ان دشمن اسلام تحریکوں کے خلاف انگلی بھی نہ اٹھاتے اور چپ سادھے تماشہ دیکھتے رہتے۔

مگر یہ غلط اور قطعی غلط اور بے بنیاد بات ہے' اس لیے کہ مولانا کے سوانح خود گواہی دیتے ہیں' کہ جب کبھی ملک میں ایسی تحریک چلی ہے' انہوں نے سخت ایجی ٹیشن کی اور کرائی ہے' اور ان کی مذہبی و ملی غیرت اور حمیت یہ گوارا نہیں کر سکی کہ مسلمان کو آنچ بھی پہنچے اور اس کا دین خطرے میں پڑ جائے' انگریزی حکومت کے وقت بھی ایسی تحریکیں اکثر سر نکالا کرتی تھیں' اور انگریز اپنی حکومت کے استحکام کے لیے خود ایسی تحریکوں کی شدید ضرورت محسوس کرتا تھا' تاکہ ہندو اور مسلمان سر جوڑ کر نہ بیٹھ سکیں اور غلامی کے جوئے سے گردن نہ نکال سکیں' مگر یہ حقیقت ہے' کہ جب کبھی بھی ایسی تحریک چلی' مولانا آزاد نے اس کی سخت مخالفت کی' مثال کے طور پر ہندو سنگھٹن تحریک کو انہوں نے بہت ہی ذلیل اور زہرناک سمجھا' اور اپنے ایک مقالے میں لکھا کہ:

"میں نے ۱۹۱۲ء میں اپنے تمام ہم مذہبوں کے مسلک کے خلاف اپنی صدا بلند کی تھی' اور ان کی مخالفت کا خوف مجھے اظہار حق سے نہ روک سکا تھا' ٹھیک اسی طرح آج میں اپنا پہلا فرض سمجھتا ہوں' کہ ان تمام بھائیوں (ہندوؤں) کے خلاف بھی اپنی صدا بلند کروں' جو "ہندو سنگھٹن کی تحریک کے علمبردار ہیں۔" (الجمعیة)

علاوہ بریں مولانا کی صحافتی زندگی پر بھی نگاہ ڈالنے کی ضرورت ہے' کہ انہوں نے مولانا شبلی مرحوم کے جریدہ "الندوہ" کو خاص تبلیغی مشن کی خاطر اپنے ہاتھ میں لیا' اخبار "الہلال" جاری کیا تو خالص تبلیغی اور اشاعتی مقاصد کے لیے' جس کے سیاستدانوں سے زیادہ علماء اور دین پسند لوگ خریدار تھے اور جس کو عوام سے زیادہ اسلام کے مبلغ و مناظر پڑھتے تھے' پھر "البلاغ" جاری کیا تو تبلیغ و اشاعت اسلام کی غرض سے۔ دینی کتابیں لکھیں تو صرف اس لیے کہ داخلی اور خارجی تبلیغوں کے تقاضے پورے ہوں' اور ﴿ اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَاللّٰهِ الْاِسْلَامُ ﴾ کا پرچم توحید دنیا کی انتہائی بلندی پر لہرائے' اور اس جھنڈے تلے تمام ملل و اقوام جمع ہو کر ﴿ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِیْكَ لَهٗ وَ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَ رَسُوْلُهٗ ﴾ کا اقرار کر لیں۔

اخلاقی تبلیغ

ہاں! ایک بات یاد رکھیے' کامیاب اور فاتح مبلغین کبھی ایسے جوش و غضب کا اظہار نہیں کرتے' جس سے دوسروں کے دل مسخر ہونے کی بجائے اور بھی متنفر ہو جائیں' اسلام نرمی اور تہذیب و اخلاق سکھاتا ہے' اور یہ تعلیم دیتا ہے کہ تبلیغی سلسلے میں دوسروں کے بزرگان مذہب کا احترام کیا جائے' اور کسی کی ایسی ہجو و توہین نہ کی جائے' جو تبلیغ کا مقصد ہی برباد کر دے' حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسری' حضرت مولانا قاضی محمد سلیمان پٹیالوی' حضرت مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی اور حضرت مولانا

ابوالکلام آزاد رحمہم اللہ تعالیٰ اجمعین' ایسے ہی مبلغین و مناظرین تھے' جن کی خطابت سننے کے لیے ایک دنیا لپکتی تھی' دوست اور دشمن اڈتے چلے آتے تھے' اور ان کے ایک ایک لفظ پر سر دھنتے اور جھومتے تھے' ان حضرات کا یہ انداز تبلیغ ہمیں ان کی راہ پر چلنے کی دعوت دیتا ہے' تاکہ ہم بھی ان کی طرح کامگار و کامیاب ثابت ہوں۔

احکام اسلام کی پابندی

اللہ اکبر' ایک شخص کتاب حق اور سنت رسول اللہ ﷺ کے عشق و محبت میں دیوانہ ہو جائے' وہ شبانہ روز قرآن کریم اور حدیث نبوی کے مطالعہ میں مصروف رہے' اور ہر بات' ہر معاملہ' ہر تقریر' ہر تحریر میں فرمودۂ خدا اور گفتہ پیغمبر ﷺ کو پیش نظر رکھے' اور پھر اس پر یہ الزام لگایا جائے' کہ وہ دین کے احکام کی پابندی نہیں کرتا' العیاذباللہ! یہاں تک کہ وہ نماز نہیں پڑھتا' روزے نہیں رکھتا' اور شریعت کے احکام کی تعمیل میں پس و پیش سے کام لیتا ہے' کس قدر بہتان طرازی اور ستم ظریفی ہے! مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ پر یہ الزامات ایک معاند و مخالف گروہ کی طرف سے اس وقت سے لگائے جاتے ہیں' جب سے انہوں نے کانگریس کی صدارت و رکنیت قبول کی ہے' اور آج ان کے رحلت فرمانے کے بعد ان کی طرف سے یہ الزامات برابر لگائے جا رہے ہیں' پس انہی حالات میں ہم مجبور ہوئے' کہ ان کی پابندی شرع سے متعلق بھی ایک عنوان قائم کریں' حالانکہ اس کی چنداں ضرورت نہ تھی۔

نماز

مولانا حفظ الرحمان ناظم عمومی جمعیتہ العلماء ہند' حضرت مولانا آزاد کی عبادت کے متعلق لکھتے ہیں:

"حضرت مرحوم کی زندگی میں ایک دن بھی ایسا نہیں گذرا کہ سکون شب و سعادت اولین کی وہ گھڑیاں جب کہ دنیا بستر راحت پر خواب شیریں کے مزے لوٹتی ہے' رجوع و انابت الی اللہ مراقبہ و عبادت میں نہ گذری ہوں' ان کا معمول تھا کہ رات کو بہت جلد عموماً نو بجے سو جاتے تھے' اور صبح گاہی دو تین بجے روزانہ بیدار ہوتے' اور اول چار رکعت سے آٹھ رکعت تک اللہ کے حضور میں سربسجود و جبیں بہ نیاز ہونے کے بعد خود اپنے چائے کے شوق سے فارغ ہوتے اور پھر تفسیر قرآن یا آیات الٰہی کے کسی عنوان پر غور و فکر میں صبح کی نماز تک مشغول رہتے اور نماز فجر پڑھ کر اپنے دنیوی مشاغل میں مصروف ہو جاتے۔" (الجمیعۃ)

اسی سلسلے میں حکیم سید محمد الیاس صاحب کھوڑی کی تحریر کا ایک اقتباس بھی پڑھ لیجئے' جس سے معلوم ہو سکے گا' کہ مولانا کانگریس کے اجلاسوں میں بھی پابندی نماز کا کس قدر خیال رکھتے تھے:-

"مولانا مرحوم ارکان اسلام کی پابندی میں انضباط اوقات کا پورا لحاظ فرماتے تھے' مولانا نماز کی بھی کافی پابندی فرماتے تھے' میرا اپنا مشاہدہ ہے' کہ دہلی میں کانگریس سیشن ہو رہا تھا' غالباً سبھاش چندر بوس صدر اجلاس تھے' مولانا بھی شرکت اجلاس کی غرض سے تشریف لائے تھے' میں بھی اجلاس میں شریک تھا' پنڈال کے قریب ایک ٹینٹ صرف نماز کے لئے نصب کیا گیا تھا' مولانا نے مجھ سے فرمایا' میں ایک کام آپ کے سپرد کرتا ہوں' وہ یہ کہ جب جماعت تیار ہو مجھے مطلع کر دیں۔ عموماً اجلاس کے اوقات میں دو ہی نمازیں پڑھی جاتی تھیں' عصر و مغرب' چنانچہ میں مولانا کو مطلع کر دیا کرتا تھا' خواہ کتنے ہی اہم مسائل کیوں نہ پیش ہوں' مگر مولانا فوراً نماز کے لئے تشریف لاتے تھے' مولانا کے آتے ہی نماز شروع ہو جاتی تھی' اسی طرح میرٹھ کانگریس سیشن میں مولانا کی نمازوں کی ادائیگی کا یہی اہتمام رہا'

اجلاس میں خواہ کتنے ہی اہم مسائل نہ پیش ہوں، مگر حضرت نماز کے لئے تشریف لے جاتے تھے، اور شام کے اجلاس میں عموماً نماز عصر سے فارغ ہو کر تشریف لاتے تھے، میرے کچھ احباب نے کانگریس ورکنگ کمیٹی کو چائے پر مدعو کیا، انتظام پنڈال کے قریب ریسٹوران میں کیا گیا تھا، وقت مقررہ پر تقریباً تمام ممبران تشریف لے آئے مگر مولانا کو تشریف لانے میں دیر ہو گئی معلوم ہوا، کہ مولانا نماز ادا فرما رہے ہیں۔"

نماز کے فلسفہ کو سمجھانے، اس کی ادائیگی کا پابند رہنے اور اس میں تساہل و تغافل نہ کرنے کے متعلق مولانا آزاد ہی کی ایک تحریر ملاحظہ فرمایئے لکھتے ہیں:

"کاشت کار پھل کے لیے بیج بوتا ہے، پھولوں کی محبوبیت اس میں ہے، کہ ان کی خوشبو سے دماغ معطر ہو جاتا ہے، پس اگر بیج پھل نہ لائے، اور پھول خوشبو نہ دیں، تو کاشت کار کے لیے ہل جوتنے کی جگہ بہتر تھا کہ گھر میں آرام سے سوتا، اسی طرح بے خوشبو کے پھولوں سے وہ ٹہنی زیادہ قیمتی ہے، جو چولہے میں جلائی جا سکے ﴿فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ﴾ ان نمازیوں کے لیے ہلاکت و نامرادی ہے، جو اپنی نماز میں غفلت شعاری سے کام لیتے ہیں۔"

ایک صاحب کو خط میں نماز کی تاکید فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اگر کوئی امر مانع نہ ہو، تو نوافل تہجد کی مداومت کرو، فرائض کے علاوہ تمام نمازیں حتیٰ الوسع تنہائی میں پڑھی جائیں اور استحضار قلب کی پوری پوری کوشش کی جائے۔"

اللہ اللہ! جس آزاد کی ساری عمر عبادت و ریاضت میں گذری، خود نمازیں پڑھتے اور دوسروں کو پڑھاتے اور پڑھنے کی تاکید کرتے گذری اور جس نے بچپن سے لے کر آخری وقت تک کبھی نماز ترک نہ کی اس کو ستمگاران زمانہ "بے نماز" کہہ رہے ہیں، انا للہ!

روزہ

پابندیِ صوم' احترامِ رمضان' نمازِ تراویح اور اعتکاف وغیرہ سے متعلق مولانا آزاد کی صرف ایک تحریر دیکھ لینا کافی ہو گی' فرماتے ہیں:

"اسی اثناء (قیامِ رانچی) ۱۹۱۶ء میں رمضان المبارک کے برکات و نعائم کا دورہ ہوا' اگرچہ نماز باجماعت کی کیفیت انجمن طراز اور جماعت تراویح و سماع تلاوت کی لذت دل نواز سے اپنی عمر میں پہلی مرتبہ محرومی رہی' اور اس لیے ابتداء کے دو چار دن یک گونہ انقباض و دل گرفتگی میں بسر ہوئے' لیکن اس کے بعد ہی مقامِ خلوت کی کیفیتوں اور انجمن در خلوت کی خود رنگیوں کا عالم کچھ اس طرح طاری ہوا کہ دنیا جہان کی ساری صحبتوں اور انجمنوں سے دل بے پروا ہو گیا' علی الخصوص عشرۂ اخیر کے شبہائے تمنا اور روز ہائے انتظار کی بخششوں اور کامرانیوں سے دل نے جو جو سعادتیں اور چشم و گوش نے لطف دید و ذوق سماع کی جو جو دولتیں لوٹیں' نہ دنیا کی کوئی زبان ان کی ترجمانی کر سکتی ہے' نہ سامعہ استعداد سماع رکھتا ہے' البتہ حسرت رہی تو یہ رہی کہ کاش! پوری زندگی کی وسعت کسی طرح ان دس راتوں میں آ جاتی اور ساری عمر اسی عالم میں بسر ہو جائے۔ ("تذکرہ" صفحہ ۳۱۱)

اور اس پر بھی یہ الزام کہ آزاد روزے نہیں رکھتا تھا اور رمضان شریف کا احترام نہیں کرتا تھا' العیاذ باللہ!

پردہ

مولانا آزاد پردۂ نسواں کے زبردست حامی تھے' اور نہ صرف حامی ہی تھے'

بلکہ خود اس پر سختی سے عمل کیا' اور اپنے اقارب سے کرایا' دورِ حاضر کے عام لوگ مسلمان ہونے کے باوصف پردے کو ضروری نہیں سمجھتے' اور اپنی عورتوں کو بے نقاب لیے پھرتے ہیں' لیکن مولانا آزاد کے متعلق کسی کو اتنا علم بھی نہ ہو سکا' کہ آپ بیاہے ہوئے ہیں' اور کوئی بیوی بھی رکھتے ہیں' حالانکہ آپ نے پورے ۳۶ سال ازدواجی زندگی بسر کی' رفیقہ حیات کا نام زلیخا تھا' مولانا آزاد قلعہ احمد نگر میں اسیر تھے کہ بی بی زلیخا ۱۹/ اپریل ۱۹۴۳ء کو اللہ کے پاس پہنچ گئیں۔ جب یہ خبر اخبارات میں چھپی' تو اس روز لوگوں کو معلوم ہوا کہ وہ شادی شدہ تھے' اور ایک ایسی شریک زندگی رکھتے تھے' جس کی شکل دیکھنا تو درکنار' کسی نے اس کو پردے میں بھی کہیں آتے جاتے نہیں دیکھا' اس کا نام ہے احکام شرع کی پابندی۔ کہ بیوی پر مہرو ماہ کی نگاہیں بھی نہیں پڑ سکیں۔

تصویر

ایک اور الزام آزاد مرحوم پر یہ لگایا جاتا ہے' کہ وہ تصویریں کھینچنے کھنچوانے کو عیب اور گناہ نہیں سمجھتے تھے' اور اپنا فوٹو شوق سے اتروا لیتے تھے' مگر یہ بھی قطعی غلط ہے' اور دوسرے الزامات کی طرح بالکل بے بنیاد ہے' جس کے ثبوت میں مولانا آزاد کی کتاب "تذکرہ" کے مقدمہ کا ایک پیراگراف ذیل میں درج کیا جاتا ہے' جو ان کے ایک عزیز فضل الدین احمد نے لکھا ہے:

"موجودہ زمانہ میں کسی شخص کی سوانح عمری کا بغیر فوٹو کے شائع کرنا ایک ایسی بد مذاقی ہے جس کو کوئی خوش مذاق آدمی گوارا نہیں کر سکتا۔ علاوہ بریں مولانا کے ہزاروں ارادتمند ہیں' جن کو بڑی مایوسی ہوتی' اگر کتاب ان کے فوٹو سے خالی ہوتی۔ اس لیے میں نے کوشش کی' کہ مولانا کا فوٹو حاصل کر کے درجِ تذکرہ کروں' مجھے معلوم ہے' کہ انہوں نے اپنی تصویر

کی اشاعت کی ہمیشہ مخالفت کی' الہلال میں دنیا جہان کی تصویریں نکلتی رہیں' مگر لوگوں کے سخت اصرار پر بھی انہوں نے اپنا فوٹو نہیں شائع کیا' اخبار جمہور کلکتہ میں ان کے فوٹو کا اعلان شائع ہوا' تو اس پر وہ سخت برہم ہوئے' پھر مجھے لکھا' کہ جس قدر کاپیاں تیار کی گئی ہوں میری طرف سے خرید کر رکھ لو' اور شائع نہ ہونے دو' جب میں نے تصویر کی نسبت کہا تو انہوں نے لکھا کہ' تصویر کا کھنچوانا' رکھنا' شائع کرنا سب ناجائز ہے۔ یہ میری سخت غلطی تھی' کہ تصویر کھنچوائی اور "الہلال" کو باتصویر شائع کیا' میں اب تائب ہو چکا ہوں' میری پچھلی لغزشوں کو چھپانا چاہیے' نہ کہ از سرنو تشہیر کرنی چاہیے۔ (تذکرہ)

اس سے معلوم ہوا کہ مولانا نے اپنی مرضی سے کبھی فوٹو نہیں کھنچوایا غالباً جس قدر تصویریں لی گئیں' ان کی لاعلمی میں لی گئیں' اس سے بھی ان کی شریعت نوازی اور ان کے احکام اسلام کی پوری تعمیل کا پتہ چلتا ہے' یہاں تک کہ وہ ذرا ذرا سی باتوں میں بھی محتاط رہتے تھے' کہ کوئی ایسا فعل سرزد نہ ہو جائے' جو دین کے خلاف ہو' تاہم بہ تقاضائے بشریت اگر کبھی ایسا ہو جاتا' تو انہیں فوراً تائب ہونے اور اپنے کیے پر پچھتانے اور اس کی معافی بارگاہ رب العزت سے مانگنے میں دیر نہ لگتی' کہ اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ بندوں کا یہی خاصہ ہے۔

سیاسی نظریات

مولانا آزاد کے سیاسی نظریات کو معلوم کرنے سے پہلے اس بات کی اشد ضرورت ہے' کہ اسلام کے نظریہ سیاست کو سمجھنے کی کوشش کی جائے' اور یہ دیکھا جائے' کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول مقبول ﷺ نے مسلمانوں کے سامنے وطنیت کا کیا تصور و تخیل پیش کیا ہے' اور سیاسیات میں اہل اسلام کو کس راہ پر چلنے کی

ہدایت فرمائی ہے۔

عالمگیر وطنیت

جب ہم قرآن و حدیث کا بنظرِ غائر مطالعہ کریں گے' اور پھر تاریخ اسلام کے ورق الٹیں گے' تو یہ راز بے نقاب ہوتے دیر نہ لگے گی' کہ اسلام نے مسلمانوں کو جو وطنیت دی ہے' اس کو کسی خاص دائرے کے اندر محدود نہیں کیا ہے۔ بلکہ اس نے اسلامی وطنیت کے حدود کو اس قدر وسعت بخشی ہے' کہ دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ڈانڈے ملا دیئے ہیں' مشرق و مغرب اور شمال و جنوب کو آپس میں اس قدر متصل کر دیا ہے' کہ مسلمان کے دل میں اس کے بعد و تبائن' بیگانگی و مغائرت کا شائبہ تک پیدا نہ ہو سکے' اور وہ ساری کائنات کو اپنا وطن اور ساری دنیا کو اپنا دیس سمجھے' اس سلسلے میں پہلا سبق مسلمانوں کو یہ دیا گیا کہ ﴿ فَانْتَشِرُوْا فِي الْأَرْضِ ﴾ مسلمانو! زمین پر بکھر جاؤ! اور سارے جہان میں پھیل کر جگہ جگہ اپنی قیام گاہیں بنا لو' تاکہ ساری دنیا تمہارا وطن بن جائے' اور تمام ممالک تمہارے زیرِ اثر اور زیرِ اقتدار آ جائیں۔ تجارت کی تاکید بھی اسی غرض سے کی گئی' اور مقصد ان سارے احکام کا یہ اور صرف یہ تھا' کہ حق تبلیغ ادا کیا جائے' اور دنیا کے ایک ایک گوشے میں توحید و رسالت کی اشاعت کر کے تمام اہل جہان کو اسلام کے قبول کرنے کی دعوت دی جائے' پس جس طرح اسلام نے اخوت اور مساوات کو شانِ عالمگیری عطا فرمائی اسی طرح اس نے وطنیت کو بھی جہانگیر بنا دیا' اور یہ اسی عالمگیر اسلامی وطنیت کا نتیجہ ہے' کہ آج دنیا کے کونے کونے میں کلمہ گویانِ رسول ﷺ کا وجود مسعود نظر آ رہا ہے' اور مرکزِ کعبہ کی شاخیں تمام کائنات عالم میں پھیلی ہوئی ہیں۔

اسلامی ممالک مفتوحہ

اسلام کے اسی نظریہ سیاست و وطنیت کو اپنانے کے لیے مسلمانوں نے فتوحات کا سلسلہ شروع کیا' اور دنیا کے اکثر ممالک ان کے زیر نگیں آ گئے' مسلمان جہاں بھی فاتحانہ انداز سے داخل ہوئے' وہاں توحید کے جھنڈے گاڑے' فرض تبلیغ ادا کیا اور اسی ملک کو اپنا وطن بنالیا' ایسا وطن جیسے اسی خاک سے پیدا ہوئے' اور اسی کو وطن مالوف و محبوب سمجھا' اور اس کی حفاظت کے لیے اپنی جانیں تک قربان کر دیں۔ مسلمانوں نے جس مفتوحہ ملک میں اسلام کے پرچم نصب کیے' پھر اس کو دوسروں کے قبضہ میں دینا گناہ عظیم خیال کیا' از بسکہ قرآن و حدیث کی رو سے سیاست کو مذہب کے تحت رکھا گیا ہے' اور دین خدا کی نگاہوں میں اسلام اور سیاست اسلامی میں کوئی فرق نہیں ہے' اور نہ یہ جدا گانہ چیزیں ہیں' جیسا کہ علامہ اقبالؒ نے بھی کہا ہے۔

جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی!

پس مسلمانوں نے کسی عنوان یہ برداشت نہ کیا' کہ جو ملک ایک دفعہ اسلام کے زیر نگیں آ جائے' اور جس میں ایک بار اسلامی حکومت قائم ہو جائے' اس پر کبھی کفار و مشرکین بھی قبضہ کر سکیں اور اس میں اسلامی آئین کی بجائے پھر کافر و مشرک اقوام کا تیار کردہ قانون نافذ ہو سکے' یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں نے جس حصہ زمین پر بھی اسلام کی حکومت قائم کی' اس کو کفار و مشرکین سے بچانا' اس کی سالمیت کو قائم رکھنا اور اس کو مضبوط و مستحکم کرنا ان کے دینی فرائض میں داخل ہو گیا۔

ہندوستان کی پوزیشن

شام و یمن' مصر و عراق' ترکی و ایران' افغانستان و فلسطین کی طرح ہندوستان

بھی ایک ایسا ملک ہے، جس کو مسلمانوں نے فتح کر کے اس میں توحید الٰہی کے پھریرے لہرائے اور اسلامی حکومت کا قیام عمل میں لائے، محمد بن قاسم، محمود غزنوی، ظہیرالدین بابر، اورنگ زیب عالمگیر، شاہ جہان، نورالدین جہانگیر، شیر شاہ سوری ایسے شاہان اسلام کا اسم گرامی رہتی دنیا تک زندہ و قائم رہے گا، جنھوں نے کفرستان ہند میں اللہ کا نام بلند کیا، اور اپنی مجاہدانہ سرگرمیوں سے اس میں اسلام کے جھنڈے گاڑے، آج ہندوستان میں یہ جو کروڑوں مسلمان ﴿ قَالَ اللّٰهُ وَ قَالَ الرَّسُوْلُ ﴾ کے نعرے لگاتے دکھائی دیتے ہیں، یہ انہی فرمانرواؤں کے فیوض و برکات کا نتیجہ ہے۔

ہندوستان میں مسلمانوں نے کم و بیش ایک ہزار سال تک کروفر سے حکومت کی ہے جس کے آثار اسلامیہ اس کے چپے چپے پر نظر آتے ہیں۔

ابھی اس راہ سے گذرا ہے کوئی
کہے دیتی ہے شوخی نقش پاکی

لیکن ﴿ تُؤْتِی الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ ﴾ کا فرمان نازل کرنے والی ذات اقدس نے جب دیکھا، کہ مسلمان حکمران عیاشیوں اور بدکرداریوں میں مبتلا ہو گئے ہیں، اور ان کی کوتاہیوں، بدعملیوں، بددیانتیوں، عیش پرستیوں اور حرا مکاریوں نے انہیں اس قابل نہیں چھوڑا، کہ اب وہ تاج و تخت کے مالک بن کر ملک پر حکومت کر سکیں، تو غیور و قہار خدا نے ﴿ تَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ ﴾ کا قانون نافذ فرمایا، اور ہزار برس حکومت کرنے والے مسلمان فرمان رواؤں سے ہندوستان ایسے چالیس کروڑ انسانوں کے وسیع ترین ملک کی سلطنت ان سے چھین لی، خود مختار بادشاہوں کو ملک بدر اور اسیر ہونا پڑا، اور اس انگریز نے ان کے تاج و تخت پر قبضہ کر لیا، جو ایک روز انہی کی منت سماجت کر کے ان کے ملک میں تجارت کرنے آیا تھا۔

آگ لینے گئی تھی شر والی
اور بن بیٹھی جا کے گھر والی

علمائے ہند کا انگریزوں اور سکھوں سے جہاد

مسلمانوں سے حکومت چھین کر ایک طرف تو سلطنت اسلامیہ ہند پر انگریزوں نے جبراً قبضہ جمالیا' دوسری طرف پنجاب میں سکھوں نے اودھم مچایا' اور انہوں نے نہ صرف مسلمانوں کی حکومت ہتھیالی' بلکہ ان پر بے پناہ مظالم بھی توڑے جانے لگے' ان حالات میں ہندوستان کے وہ علمائے کرام جن کے دل جذبہ جہاد سے بھرپور تھے' کب خاموش رہ سکتے تھے' وہ میدان مجادلہ میں کود پڑے' اور اللہ کی تلواریں سونت کر اسلام کی کھوئی ہوئی سلطنت' عظمت' اور شوکت کو دوبارہ حاصل کرنے کے لیے انگریزوں اور سکھوں سے نبرد آزما ہو گئے' یہ مجادلات در حقیقت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی علیہ الرحمۃ کی تحریکات کے زیر اثر تھے' اور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خلفائے نامدار سید احمد بریلوی علیہ الرحمۃ' شاہ اسماعیل علیہ الرحمۃ ایسے مجاہدین کرام نے یہ جہاد شروع کیا تھا' اور اس کا مقصد یہ اور صرف یہ تھا' کہ ہندوستان کو کافر و مشرک غاصبوں سے پاک کر کے اس میں اسلامی خلافت قائم کی جائے۔

ولی اللہی مشن ہی کی ایک شاخ "تحریک وہابیت"[1] تھی جس میں علمائے ہند نے خوب حصہ لیا' اور انگریزوں کو ہندوستان سے نکال کر اس میں اسلامی حکومت قائم کرنے کے لیے ان سے بے جگری کے ساتھ لڑے' مگر افسوس' کہ بے سرو سامانی' پھوٹ اور بعض قسم کی غداریوں نے جو ملک اور قوم کے اندر پیدا ہو چکی تھیں' ان مجاہدین اسلام کو کامیاب و کامگار نہ ہونے دیا' اور بالآخر سارے ہندوستان پر انگریز نے مکمل قبضہ جمالیا۔

---

[1] "تحریک وہابیت" نام سے معلومات افزاء الگ کتاب بھی چھپ چکی ہے۔ احباب مسلم پبلی کیشنز سوہدرہ گوجرانوالہ کے پتہ سے منگوا سکتے ہیں۔ (فاروقی)

آزاد کا نظریہ سیاست

مولانا ابوالکلام آزاد جنہوں نے شاہ ولی اللہ علیہ الرحمۃ کی تعلیمات و تحریکات اور آپ کے خلفاء کے مجاہدات و مجادلات کا خوب مطالعہ کیا تھا' اوائل عمر میں ہی یہ اسپرٹ (Spirit)' یہ جذبہ اپنے دل میں رکھتے تھے کہ جیسے بھی ممکن ہو' ہندوستان کو جو ہزار بارہ سو سال سے مسلمانوں کا وطن اور دول اسلامیہ کا ایک ٹکڑا بن چکا تھا' انگریز کی غلامی سے آزاد کرا کے مسلمانان ہند کو اس قابل بنا دیا جائے' کہ وہ اپنے کھوئے ہوئے تاج و تخت کو پھر حاصل کر سکیں اور حکومت کرنے کے لائق ہو جائیں۔ اسی جذبہ اسی جوش اسی ولولہ کے ساتھ انہوں نے اپنی سیاست کا آغاز کیا' اور اس وقت کیا جب کہ ان کی ابھی مسیں ہی بھیگ رہی تھیں' جوانی کا تازہ خون شباب کی سرمستیاں اور رنگینیاں عام طور پر انسان کی نوجوانی کو غلط راستے پر لگا دیتی ہیں' لیکن آزاد کی نوجوانی کچھ عجیب قسم کی تھی' کہ اس کی بہار نے انہیں سیاسی زندگی میں الجھا دیا۔ ادھر ان کا شباب جوش میں آکر ابھرا ادھر وہ دست و گلو میں پھولوں کے ہار اور گجرے پہننے کی بجائے' فولاد کی ہتھکڑیوں' بوجھل بیڑیوں اور طوقوں سے روشناس کرائے گئے' عوام کا جوبن تفریح گاہوں اور عشرت کدوں میں لٹ رہا تھا' اور آزاد کی جوانی جیل کی سلاخوں سے کھیل رہی تھی' اس لیے اور صرف اس لیے کہ ملت اسلامیہ ہند جس حریت و آزادی سے محروم کی گئی ہے' اس کو انگریز سے چھین کر پھر سے اس کے ہاتھ میں دیا جائے' اور اللہ تعالیٰ کے اس قانون کا ڈھنڈورا چار دانگ عالم میں پیٹا جائے' کہ مسلمان آزاد رہنے کے لیے پیدا ہوا ہے' آزادی اس کا پیدائشی حق ہے' وہ باطل سے نہ کبھی دبا ہے نہ دبے گا اور پرستاران اسلام نے نہ کبھی کفار کی غلامی قبول کی ہے نہ کبھی قبول کریں گے۔

دنیا میں ٹھکانے دو ہی تو ہیں   آزاد منش انسانوں کے

یا تختہ جگہ آزادی کی ! یا تخت مقام آزادی کا

احیائے قوم و ملت

مولانا ابوالکلام آزاد نے انگریزی حکومت اور اس کے جور و تشدد کے خلاف ۱۹۱۰ء کے قریب آواز اٹھائی اور اسی سال اپنی سیاسی زندگی کا آغاز کیا' لیکن ایک غیر ملکی جابر و ظالم حکومت' اور اس کی قہرمانیوں سے ٹکر لینا اور ملک و ملت کے پاؤں سے غلامی کی زنجیریں کاٹنا تنہا مولانا آزاد کے بس کی بات نہ تھی' وہ کہنے کو اس پر کمر بستہ تو ہو گئے اور دل میں آزادی دلانے کا عزم صمیم بھی کر لیا' لیکن جب تک ملک کے عام مسلمان ان کے ہمنوا نہ بنتے اور ان کے مشن کو کامیاب بنانے کے لیے جوش عمل نہ دکھاتے' اس وقت تک کامیابی دشوار ہی نہیں ناممکن تھی۔

پس مولانا آزاد نے سوچا' کہ جب تک ہندوستان کے مسلمانوں کو بیدار نہ کیا جائے' اور راستہ ہموار نہ کیا جائے' میدان جہاد میں کودنا ناموزوں ہے۔ اور غلامی کی جو بدبو ان کے دماغوں اور ذہنوں کو متعفن کر چکی ہے' جب تک اس کے بد اثرات زائل نہ کیے جائیں' اس وقت تک تحریک حریت کو جامہ عمل پہنانا اور برٹش گورنمنٹ سے مصروف پیکار ہونا مناسب نہیں' چنانچہ انہوں نے سب سے پہلے اپنی تقریروں اور تحریروں میں علمائے ہند ہی کو مخاطب کیا' انہیں وقت کی ضرورت و اہمیت بتائی۔ ان کو غیرت دلائی اور عظمت رفتہ کا احساس دلایا' کتاب و سنت کے بھولے ہوئے سبق یاد دلائے' اسلامی تعلیمات سے روشناس کرایا' اور اپنے انہی مقاصد عظیمہ کو بروئے کار لانے کے لیے انہوں نے ۱۹۱۲ء میں "الہلال" اور اس کے بعد "البلاغ" ایسے روح پرور' ایمان افروز اور حریت بردار جرائد کا اجراء فرمایا۔ جنہوں نے سوئی ہوئی قوم کو بیدار کر دیا۔

صور اسرافیل

آزاد مرحوم اپنے جرائد میں انقلاب آفریں نگارشات کچھ ایسے جذب و تاثیر سے قلم بند فرماتے کہ دشمن بھی ایک بار تو ان کا لوہا مان جاتا' پھر انہوں نے جلسوں اور اجتماعات میں بھی مسلمانوں کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر جگانے اور ان کے مردہ دلوں میں تازہ روح پھونکنے کی از حد سعی مسلسل کی اور انہیں پکار پکار کر کہا کہ:

> "آہ! کاش مجھے وہ صور قیامت مل جاتا' جس کو لے کر میں پہاڑوں کی بلند چوٹیوں پر چڑھ جاتا' اس کی ایک صدائے رعد آسائے غفلت شکن سے سر کشتگان خواب' ذلت و رسوائی کو بیدار کرتا اور چیخ چیخ کر پکارتا' کہ اٹھو! بہت سو چکے اور بیدار ہو جاؤ کہ اب تمہارا خدا تمہیں بیدار کرنا چاہتا ہے' پھر تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ کہ دنیا کو دیکھتے ہو' پر اس کی نہیں سنتے جو تمہیں موت کی جگہ حیات' اور زوال کی جگہ عروج اور ذلت کی جگہ عزت بخشنا چاہتا ہے۔"

ہندوستان کی ملت اسلامیہ کو انگریز نے غلامی اور غفلت شعاری کی افیون کچھ اس طور کھلائی ہوئی تھی' کہ اس کا جگانا اسے ہوش میں لانا اور اس کو تغافل و جمود سے نکالنا سخت مشکل تھا' تاہم آزاد نے ہمت نہ ہاری' وہ اسے سر اور شانوں سے پکڑ پکڑ کر جھنجھوڑتے اور جھٹکتے رہے' اور یہی تلقین فرماتے رہے' کہ علمائے ہند کو ۱۸۵۷ء میں جو شکست کھانا پڑی ہے اب وقت کا تقاضا تمہیں مجبور کرتا ہے' کہ اٹھو فوراً اس کی تلافی کے لیے کمر ہمت باندھ لو اور جو کام پیش رو مجاہدین نے ادھورا چھوڑا ہے' جیسے بھی بن پڑے اسے تکمیل تک پہنچاؤ۔

اسی مقصد کی تکمیل کے لیے دہلی میں "جمعیتہ العلماء" کی داغ بیل رکھی گئی' اور خود مولانا اس کے سرپرست اور کنوینر بن گئے' تاکہ علماء ہند کی اس جماعت

کے ذریعے ایک تو ہندوستان میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت ہوتی رہے' دوسرے مسلمانان ہند میں جہاد و حریت کا جوش و جذبہ پیدا کیا جائے' تاکہ وہ اپنے احساس کمتری اور احساس غلامی کو سمجھنے کی صلاحیت رکھیں' اور جنگ آزادی میں شریک ہونے کے لیے تیار ہو سکیں۔

جہاد کی ترغیب

مولانا آزاد پر اعتراض کیا جاتا ہے' کہ وہ کانگریس میں شامل ہو کر گاندھی کی تعلیمات کے دلدادہ ہو گئے' اور جنگ و جہاد کے مخالف بن کر اہنسا (سلامتی' بچاؤ) اور عدم تشدد کو تسلیم کرنے لگ گئے۔ لیکن یہ اعتراض بھی دیگر اعتراضات کی طرح قطعی غلط اور بے بنیاد ہے' مقام غور ہے کہ جس آزاد کی ساری عمر قرآن و سنت پر عمل کرتے' اس کی تفسیر لکھتے اور دوسروں کو کتاب و سنت کے احکام پر چلنے کی تلقین کرتے گذری ہو' کیا وہ ایسے غیر اسلامی اعتقادات رکھ سکتا تھا؟ ہرگز نہیں! اس کی تردید میں آزاد کی اپنی تحریرات شاہد ہیں۔ ہم بطور نمونہ وہ پیش کرتے ہیں۔ آپ ایک جگہ لکھتے ہیں:

> "میں ان مسلمانوں سے' جو قرآن کریم سے ذرا سی واقفیت بھی رکھتے ہیں' یہ پوچھنا چاہتا ہوں' کہ کیا تم نے ﴿ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ ﴾ قرآن میں نہیں پڑھا ہے؟ اگر تم آیات جہاد سے واقف ہو' اور ان کے معانی سمجھتے ہو' تو میں انگشت بدنداں ہوں' کہ تم ایسی خاموشی اختیار کر کے کیوں تغافل و تکاہل کا لحاف اوڑھے بیٹھے ہو' جس کی شریعت اسلامیہ میں سخت ممانعت ہے؟ تمہارے پاس صرف ایک ہی بہانہ ہے اور وہ یہ ہے' کہ تم بے سرو سامان ہو' اور دنیا جہان کی بارودی میگزینیں تمہارے پاس نہیں ہیں' لیکن تمہارے

اسلاف جب جہاد کے خوف ناک شعلوں میں چھلانگیں لگاتے تھے' تو ان کے پاس کیا ہوتا تھا؟ دو ایک ٹوٹی ہوئی تلواریں اور زنگ خوردہ تیر۔ کاش! تم کتاب حق پر نظر رکھتے اور کانوں سے سنتے کہ تمہارا خدا ﴿ اَلَاۤ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغَالِبُوْنَ ﴾ کہہ کر تمہیں جہاد کی ترغیب دیتا اور پھر یہ بشارت بھی تمہارے گوش گزار کرتا ہے کہ آخر تم ہی غالب ہو گے۔ اور تمہارا دشمن منہ کی کھا کر گرے گا۔ اگر تم اب بھی نہ اٹھے۔ اور تمہاری جگہ کوئی اور آزادی پسند جماعت کھڑی ہو گئی تو تم زندگی بھر پچھتاتے رہو گے' اور پھر تمہارا یہ پچھتانا نہ صرف بے کار و بے فائدہ ہو گا' بلکہ شماتت ہمسایہ کا موجب ہو گا اور شرم و ندامت کا باعث۔" (الہلال)

پیام بیداری

الغرض مولانا ابوالکلام علیہ الرحمۃ نے مسلمانوں کو جگانے اور ہشیار کرنے میں زندگی کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا' وہ انہیں بیدار کر کے ان اسلامی خطوط پر چلانا چاہتے تھے' جن پر صحابہ کرام و تابعین رضی اللہ عنہم اور جملہ مجاہدین اسلام چلتے رہے' وہ ببانگ دہل کہتے تھے:

"اور کچھ نہیں' تو کم از کم تم اسلاف اسلام کی سیرتوں کا بکثرت مطالعہ کرو' اور دیکھو کہ انہوں نے آزادی پانے کے لیے اور انسانوں کو غلامی کے جوئے سے نکالنے کے لیے کیا کیا طریقے اختیار کیے' ان کے طریقے کوئی نئے نہ تھے' وہی تھے جو کتاب اللہ میں مرقوم ہیں' ان کی روحیں آج بھی تمہیں بیداری کا پیغام دیتی ہیں' اور تمہیں اس آزادی کی طرف بلاتی ہیں' جو ہر زادۂ اسلام کا پیدائشی حق ہے۔ میرے ہم قومو! یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے' کہ تم ظالم انگریز کے سامنے فوراً جھک جاتے ہو' اور اس کے قانون

کی اطاعت کے لیے فوراً تیار ہو جاتے ہو؟ لیکن رحیم و کریم خدا اور مقدس آئین کے سامنے کبھی نہیں جھکتے' وقت اور اس کے تقاضے تمہیں جگاتے ہیں' اور تم خراٹے لیتے ہو' اسلام تم کو اٹھاتا ہے اور تم گرنے کی کوشش کرتے ہو' شریعت تمہیں فتح کے مژدے سناتی ہے اور تم اپنے کان شکست کی خبریں سننے کے لیے لگا دیتے ہو' دین حق تمہیں احرار (آزاد لوگ) کہہ کر پکارتا ہے' اور تم غلامی کی بیڑیاں پہننا پسند کرتے ہو' تمہاری اس روش کا بے شعور حیوانات اور جنگل کے درندے بھی مذاق اڑاتے ہوں گے مگر تمہیں اس کا احساس تک نہیں۔" (الہلال)

عدالتی بیان

مولانا کی حریت نواز تحریکات کا نتیجہ آخر وہی نکلا' جو غیر ملکی جابر و قاہر حکومتوں کے وقتوں میں نکلا کرتا ہے انگریز گورنمنٹ نے انہیں ہتھکڑیوں میں جکڑ لیا' اور ان کی صدائے آزادی کو دبانے کے لیے ان پر بغاوت کے مقدمے چلائے جانے لگے۔

ایک دفعہ مولانا پر مقدمہ چلایا گیا' تو عدالت نے سوال کیا'
مولانا: آپ نے آزادی کی جو تحریک جاری کر رکھی ہے' اس کا مقصد کیا ہے' کیا آپ ہندوستان کی تمام اقوام کو آزادی دلانا چاہتے ہیں' یا کسی خاص طبقہ کو؟ عدالت کے اس استفسار پر مولانا آزاد بے اختیار کھل کھلا کر ہنس پڑے' پھر اپنے خاص انداز سے فرمایا:

"مسٹر مجسٹریٹ: غالباً آپ اس راز سے ناواقف ہیں' کہ جب کوئی مسلمان آزاد ہونے کے لیے تڑپتا ہے تو وہ محض اپنے ذاتی یا خاندانی یا قومی فائدے کے لیے یہ کوشش نہیں کرتا' بلکہ اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ

جب مسلمانوں کو آزادی ملے گی تو اس کے بدولت تمام اقوام و ملل اور تمام ادیان و مسالک کو فضائے حریت میں سانس لینا نصیب ہو گا' شریعت مطہرۂ اسلامیہ ہرانسان ابن آدم کو آزاد دیکھنا چاہتی ہے' میں اگر مسلمانانِ ہند کو بیدار کرتا اور انھیں خوابِ غفلت سے جگاتا ہوں' تو اس کا مقصد یہ نہیں کہ صرف ہندوستانی مسلمان ہی آزادی میں کامیابی پائیں اور اس ملک کی دوسری قومیں زنجیر غلامی میں جکڑی رہیں' اس کا مقصد یہ ہے کہ جب مسلمانانِ ہند اپنے مطالبہ آزادی میں کامیاب ہوں گے' تو اسلام کا عالمگیر آئین تمام دوسری ملتوں کو بھی حقوق آزادی سے محروم نہ رکھے گا' اور اسی کا نام اسلامی جمہوریت ہے۔" (نوائے اسلام)

بہرکیف' یہ تسلیم کرتے ہی بنے گی' کہ مولانا آزاد علیہ الرحمۃ نے غیر منقسم ہندوستان کے مسلمانوں میں آزادی کی روح پھونکی' ان کے مردہ دلوں کو نئی زندگی سے شناسا کیا' اور ان کے خمار غفلت کو دور کرنے میں بڑا اہم رول ادا کیا۔

اسلامی خلافت کا قیام

مولانا ابوالکلام آزاد ہندوستان میں اسی قسم کی طرز حکومت چاہتے تھے' جس قسم کی طرز حکومت خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم نے اختیار فرمائی تھی' یعنی ان کا منشا یہ تھا' کہ کفرستان ہند میں اسلامی خلافت اور اسلامی جمہوریت قائم ہو جائے' اور مسلمان کامل آزادی حاصل کرنے کے بعد اس ملک میں قرآن و سنت کا آئین نافذ کریں اور اس ازلی ابدی آئین کے سائے تلے ہندوستان کی تمام اقوام آزادانہ طور پر ہر قسم کے جائز حقوق و مراعات حاصل کر سکیں' جیسا کہ خلفائے اسلام کے زریں عہد میں ہوتا رہا ہے۔

مولانا اپنے اسی سہانے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا

زور اسی بات پر لگاتے رہے' کہ مسلمانان ہند خواب غفلت سے بیدار ہو کر منظم و متحد ہو جائیں اور غاصب انگریز کو ملک سے نکال کر اپنی کھوئی ہوئی حکومت پر قبضہ کر لیں' اس لیے کہ انگریز نے حکومت' ہندوستان کی کسی قوم سے نہیں چھینی تھی' مسلمانوں سے چھینی تھی' اور مسلمان ہی اس کو واپس لینے کا حق رکھتے ہیں اور آزادی کی جنگ میں زیادہ سے زیادہ حصہ لے سکتے ہیں' اسی مقصد کے پیش نظر مولانا نے مسلمانوں کو مخاطب کر کے ایک دفعہ فرمایا:

"دنیا ہم کو تک رہی ہے' تاریخ کے صفحات ہمارے انتظار میں ہیں' ہزاروں لاکھوں شہیدان وفا اور لاتعداد مظلوموں کی نگاہیں ہم پر لگی ہوئی ہیں سمرنا اور ایشائے کوچک کی خون آلود سر زمین سے ہمارے لیے صدائیں اٹھ رہی ہیں' ہندوستان کی پامال سرزمین کا ایک ایک ذرہ ہماری کھوج میں ہے' کیا ہمارا وجود ان سب کے لیے مایوسی کا پیام ہو گا؟ کیا ہماری نامرادی و بدبختی کی سرگذشتیں لکھی جائیں گی؟ کیا ہم تاریخ کو صرف اپنی ناکامی کی کہانی دے سکتے ہیں؟ کیا آنے والی نسلوں کی زبانوں پر ہمارے لیے صرف نفرتیں اور لعنتیں ہی ہو سکتی ہیں؟ یہی وقت ہے' جو ہمیشہ کے لیے ہماری فتح و شکست کا فیصلہ کرے گا' آؤ! اپنی قسمت کی تعمیر کریں' اپنی عزت و اقبال کو ڈوبنے سے بچائیں' اپنی فتح کو شکست کے لیے نہ چھوڑیں' ہندوستان کی آزادی اور نجات کی امید کو تاراج نہ کریں جو پھر صدیوں تک واپس نہ مل سکے۔" (الجمعیۃ)

اعلان حقیقت

ہندوستان میں اسلامی خلافت کے قیام اور برطانوی حکومت کے ساتھ جہاد حریت کے متعلق مولانا نے اپنی ایک تقریر میں کہا:

"ہم نے ایمان کا اعلان کیا ہے' خدا پرستی کا دعویٰ کیا ہے' سرفروشی و جاں ستانی کا نعرہ لگایا ہے' ہم نے قربانی و جان بازی کا ہزاروں لاکھوں مرتبہ نام لیا ہے' ہم نے حق پرستی کے عہد کیے ہیں' ملک سے عشق و محبت کا پیمان وفا باندھا ہے' ہم نے نامرادی و بزدلی کی ہمیشہ حقارت کی' (یعنی زبان سے انہیں برا کہا) ہم نے حق سے منہ موڑنے اور خدا کو پیٹھ دکھانے پر لعنتیں بھیجیں۔ ہم ان پر ہنسے جو تکلیفوں اور مشکلوں سے گھبرا گئے' ہم نے ان کی بدبختی و محرومی سے پناہ مانگی جو وقت پر اپنے دعووں میں پورے نہ اترے یہ سب کچھ ہم نے اپنی مرضی اور طلب سے کیا۔ خدا اور اس کے فرشتے ہماری زبانوں اور ہمارے دلوں پر گواہ ہیں' پھر اگر آج آزمائش کی گھڑی آ گئی ہے' اور وہ منزل سامنے ہے جس کے لیے ہم اس قدر دعوے کر چکے ہیں' تو کیا ہم عین وقت پر اپنے تمام دعوے بھلا دیں گے؟ اور ان قربانیوں کو واپس لے لیں گے؟ کیا ہمارا دعویٰ' دھوکہ ثابت ہو گا؟ کیا ہم نے جو کچھ کہا وہ جھوٹ تھا'؟ اور ہم نے اپنے ایمان اور حق کے لیے جو کچھ سمجھا وہ دھوکہ تھا۔" (الجمعیۃ)

مولانا اسی قسم کے اعلانات اکثر فرماتے رہتے تھے' اور مقصود ان سے یہ تھا' کہ ہندوستان کے تمام مسلمان اپنے کھوئے ہوئے وقار و اقتدار' عظمت و شوکت' حکومت و سلطنت کو دوبارہ حاصل کرنے کے لیے مستعد' منظم اور متحد ہو جائیں' اور کسی صورت بھی تغافل و تکاہل سے کام نہ لیں' وہ ہندوستان کو آزاد کرا کے اس میں اسلامی حکومت کے قیام کو صرف مسلمانانِ ہند تک محدود نہیں رکھنا چاہتے تھے' بلکہ اسلامی آئین کی رو سے وہ اس آزادی کو تمام دنیائے اسلام کے لیے منفعت بخش سمجھتے تھے' اور یہ خیال فرماتے تھے کہ اگر ہند کے مسلمانوں نے آزادی جیت لی اور وہ ہندوستان میں اسلامی خلافت قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے' تو اسلامی دنیا کو بہت تقویت ملے گی' اور اس کی حریت و سالمیت بھی محفوظ و مضبوط ہو جائے گی' چنانچہ

اس سلسلے میں مولانا کا بیان ان کے اپنے الفاظ میں سن لیجیے۔ ایک موقعہ پر اعلان فرمایا:

"ہندوستان کی مکمل آزادی نہ صرف مسلمانان ہند بلکہ مسلمانان عالم کے مفاد کے لئے ضروری ہے"۔ (الجمعیتہ مضمون مسٹر ہمایوں کبیر مرکزی وزیر حکومت ہند)

علامہ اقبال علیہ الرحمۃ کا تصور خلافت

علامہ اقبال مرحوم اسلام کی عالمگیر اخوت' عالمگیر مساوات' عالمگیر قومیت اور عالمگیر اتحاد کے معتقد ہی نہیں مبلغ بھی تھے' اور ان کا یہ اعتقاد ایمان کے درجہ تک پہنچا ہوا تھا' اس لیے وہ ہندوستان میں بھی کامل اسلامی حکومت کے سنہرے خواب دیکھا کرتے تھے' ان کی جملہ تصنیفات میں اس امر کی بہت سی تفصیلات ملتی ہیں' کہ جس طرح اسلاف نے اپنی فتوحات عظیمہ سے کائنات عالم کو مسخر کیا تھا' اسی طرح وہ چاہتے تھے' کہ مسلمان ہندوستان کو بھی کچھ اس انداز سے فتح کریں' کہ ان کے نقصان کی تلافی بھی ہو جائے' اور وہ ایک مضبوط اسلامی خلافت کے مالک بھی بن جائیں۔

ابتداء میں علامہ اقبال کا نظریہ سیاست یہ تھا' کہ ہندوستان کے مسلم اکثریت والے علاقے مسلمانوں کے زیر نگیں ہو جائیں' اور ان ٹکڑوں کو ملا کر ایک الگ اسلامی ریاست کا قیام عمل میں آ جائے' جیسا کہ ان کے بعض خطبات و نگارشات سے ثابت ہوتا ہے اور ان کے اسی تصور کی بنیاد پر قائد اعظم محمد علی جناح اور ان کے رفقاء نے پاکستان کی تعمیر کا نقشہ بنایا' اور اس عظیم اسٹیٹ کا سنگ بنیاد ۱۴۔ اگست ۱۹۴۷ء کو رکھا گیا۔

لیکن اقبالؒ کی نظموں کا بغور مطالعہ کیا جائے تو یہ راز بھی آشکارا ہوتا ہے کہ

بعد میں ان کا تصور خلافت ایک محدود دائرے سے نکل کر بہت وسیع ہو چکا تھا' اور وہ ان ممالک کا نقشہ اپنی آنکھوں میں لا کر اس قدر زار و قطار رویا کرتے تھے' کہ کسی وقت تو ان کی گھگیاں بندھ جاتی تھیں' وہ ممالک جن میں کبھی توحید کے پرچم نصب ہوئے تھے' اور جن کو مسلمان مجاہدین نے فتح کر کے اسلام کی تحویل میں دیا تھا' پس جس طرح وہ اندلس ایسے اجڑے ہوئے اسلامی دیار پر آہ و زاری کرتے تھے' اسی طرح ہندوستان کی مسلم حکومت کی بربادی بھی انہیں آٹھ آٹھ آنسو رلاتی تھی' اور وہ یہ چاہتے تھے' کہ اگر مسلمانان ہند پھر بیدار ہو جائیں اور ان میں اپنی دولت کے لٹ جانے کا احساس پیدا ہو' تو وہ اپنی مساعی بلیغہ سے پھر اس لوٹے ہوئے خزانے سے مالا مال ہو کر تخت کے مالک بن سکتے ہیں' ان کے کلام میں جابجا استعارات و اشارات اور رموز و اسرار ملتے ہیں۔ اور اس سے بھی وسیع تر یہ کہ وہ ساری دنیا کو اسلام کے زیر حکومت دیکھنے کے متمنی تھے! بیشک علامہ مرحوم کا یہ نظریہ بہت وسیع اور عالمگیر تھا۔ اللہ کرے ان کا یہ نخل آرزو بار آور ہو۔

مولانا آزاد کا تخیل خلافت

مولانا ابوالکلام آزاد نے سیاست وطن کا جو خاکہ اپنے ذہن میں کھینچا تھا' وہ علامہ اقبال کے بنائے ہوئے نقشے سے جدا نہ تھا' مولانا جو کچھ کہتے تھے وہ اقبال ہی کے نظریات کا عکس ہوتا تھا' اور اقبال جو کچھ تصور کرتے تھے وہ آزاد ہی کے تخیل کا آئینہ دار ہوتا تھا' دونوں حضرات دین اور سیاست کا ادغام چاہتے تھے' اور دونوں ہندوستان میں خلافت اسلامیہ کے قیام کے آرزو مند تھے' مولانا آزاد کی کتاب "تذکرہ" کے مقدمہ میں فضل الدین احمد صاحب نے خوب لکھا ہے کہ:

> "ڈاکٹر اقبال کا مذہبی عقائد میں جو پچھلا حال سنا ہے' اب ان کے مقابلہ میں ان کی فارسی مثنویاں دیکھتے ہیں تو سخت حیرت ہوتی ہے' اسرار خودی

اور رموزِ بے خودی فی الحقیقت "الہلال" ہی کی صدائے باز گشت ہیں۔"
(مقدمہ تذکرہ)

ہاں! ایک بات ان دونوں بزرگوں میں اگر مختلف تھی تو یہ کہ علامہ اقبالؒ نے شروع شروع میں ایک محدود اسلامی سٹیٹ کا تصور پیش کیا تھا' لیکن آزاد مرحوم آغاز ہی سے پورے ہندوستان میں اسلام کا جھنڈا لہرانے اور اس کو اسلامی مملکت بنانے کی فکر میں تھے۔ اور اسی لیے انہوں نے اپنے ایک خطبہ میں ارشاد فرمایا:

"ہمارا تصور آزادی اسلام کا عطا کردہ ہے' ہمیں اپنے تخیل' اپنے عزم' اپنے ارادہ کو محدود رکھنا نہیں چاہیے' مسلمان ایک وسیع و عمیق دل لے کر آیا ہے' اور اس کی یہی وسعت جس طرح اسلام کو اکناف عالم میں بکھیرتی ہے' اسی طرح ساری کائنات اس کی خلافت کے پرچم کے نیچے جمع ہونے کے لیے چشم براہ ہے' جس میں ایک ہندوستان بھی ہے' اس کے آثار اسلامیہ ہر ہندوستانی مسلمان کو اپنی عظمت رفتہ کے حصول کی دعوت دیتے ہیں اور پکار پکار کر کہتے ہیں کہ اگر حیات ابدی درکار ہے تو اس وقت تک آرام نہ کرو جب تک اپنا کھویا ہوا سرمایہ واپس نہ لے لو۔" ("تقریر آزاد" شائع کردہ خلافت کمیٹی بمبئی)

لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے' کہ مولانا کی ان تحریروں اور تقریروں کی موجودگی کے باوجود پاکستان اور ہندوستان کے مسلمانوں نے مولانا کا اصلی مقام اور حقیقی مشن سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ اور بعض اچھے بھلے لوگوں نے بڑی ٹھوکریں کھائیں۔ اگر ذہن میں پیشگی تعصب ہو تو ایسا ہو ہی جایا کرتا ہے۔

تحریک خلافت اور کانگرس

آخر جنگ آزادی لڑنے کے لیے ہندوستان میں مختلف سیاسی جماعتوں کی

تشکیل عمل میں لائی گئی‘ جمعیت علمائے ہند تو پہلے ہی قائم کی جا چکی تھی‘ اور اس کا قیام بھی مولانا آزاد ہی کی مساعی جمیلہ کا رہین منت تھا‘ کانگریس ایک پرانی سیاسی جماعت تھی‘ جس میں ہندو عنصر بہت غالب تھا‘ اور ابتداء میں اس کی باگ ڈور چند متعصب ہندو لیڈروں کے ہاتھ میں تھی لیکن بعد ازاں علی برادران‘ یعنی مولانا محمد علی‘ شوکت علی نے مولانا آزاد ہی کے اسلامی و سیاسی نظریات سے متاثر ہو کر خلافت کمیٹی قائم کر دی‘ جس نے تھوڑی ہی مدت میں ہندوستان گیر صورت اختیار کر لی‘ اور آزادی پسند مسلمانوں نے اس کے قیام کا پرتپاک خیر مقدم کیا۔

تحریک خلافت کی روح رواں

مولانا آزاد ہی تحریک خلافت کی روح اور جان تھے‘ انہوں نے اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا‘ اور اس کی کوششوں کو کامیاب بنانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی‘ آزاد مرحوم‘ علی برادران (مولانا محمد علی‘ مولانا شوکت علی) کے دوش بدوش کام کرتے‘ اور ان سے زیادہ جوش و ولولہ دکھاتے تھے‘ ان کی تقریریں اس قدر حریت انگیز اور تہلکہ خیز ہوتی تھیں‘ کہ یوں معلوم ہوتا تھا‘ مسلمانان ہند کے مردہ دلوں کو دوبارہ زندہ کرنے کے لئے صور پھونکا جا رہا ہے۔ اس وقت تحریک خلافت اور کانگریس کمیٹی کے سیاسی عقائد و نظریات الگ الگ تھے‘ خلافت کمیٹی کا نظریہ تو وہی تھا جو مولانا آزاد کا تھا‘ یعنی مسلمانوں کو جگا کر جہاد حریت کے لیے تیار کرنا اور ہندوستان میں خلافت اسلامیہ کا قیام عمل میں لانا۔ لیکن کانگریس کا نظریہ یہ تھا کہ تحریک آزادی میں مسلمانوں کا شمول چنداں ضروری نہیں‘ ہندوستان میں از بسکہ ہندوؤں کا غلبہ ہے‘ اس لئے آزادی حاصل کرنا اور ملک میں اپنے ڈھب کی حکومت قائم کرنا صرف انہیں کا حق ہے۔ یہ وہ بنیادی اختلافات تھے جو دونوں جماعتوں میں افتراق کی خلیج حائل رکھتے تھے اور دونوں کو ایک دوسرے کے قریب نہ آنے دیتے تھے۔

مولانا آزاد کی مساعی

جب آزاد مرحوم نے دیکھا کہ مسلمان بھی آزادی کے طلب گار ہیں' اور ہندو بھی آزادی کے متمنی ہیں' تو انہوں نے سوچا کہ اس دولت گرانمایہ کو حاصل کرنے کے لیے دونوں الگ الگ راستے کیوں بنائیں' اور جدا جدا راہوں پر کیوں چلیں' منزل مقصود کو پانے کیلئے اگر دونوں ایک ہی جادہ اختیار کریں' تو یہ زیادہ کامیاب اور درست طریقہ ہو گا' چنانچہ ان کی کوششوں سے افہام و تفہیم کا سلسلہ شروع ہوا اور بالآخر دونوں جماعتوں کے اشتراک عمل سے نہایت سرگرمی اور پوری قوت کے ساتھ کام ہونے لگا' مولانا آزاد کانگرس کے اجلاسوں میں بھی شرکت فرماتے اور خلافت کمیٹی کے جلسوں جلوسوں میں بھی شامل ہوتے' بلکہ دونوں جماعتوں کے اجلاسوں کی صدارت کئی مرتبہ آپ نے ہی کی' اور اپنی قوت عمل سے تحریک آزادی ہند کو اس قدر استحکام بخشا کہ برٹش گورنمنٹ کا چہرہ زرد ہو گیا۔

دراصل مولانا ابوالکلام علیہ الرحمۃ ہندو مسلم کو متحد کر کے انگریز سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اور اس کے بعد اپنے مسائل پر توجہ دینا چاہتے تھے۔ جس کے لئے انہوں نے ایک محفوظ' مضبوط اور صائب راستہ اختیار کیا۔ اور بارہا اس کا اظہار بھی کیا۔ مگر بہت سے لوگ تعصب یا قلت مطالعہ کی بنا پر آزاد کو سمجھ نہ سکے اور طرح طرح کی غلطیوں کا شکار ہو گئے۔ بلکہ ستم پر ستم یہ ڈھایا کہ مولانا کے خلاف ناروا پروپیگنڈہ شروع کر دیا۔

حریت کش سازشیں

انگریز بڑا کائیاں اور عیار تھا' جب اس نے ہندوستان کی دو بڑی قوموں میں اتحاد ہوتے دیکھا' تو اس کے منہ پر ہوائیاں اڑنے لگیں' اور وہ ایسی تدابیر سوچنے لگا'

جس سے تحریک آزادی کا خاتمہ ہو جائے' اور مسلمانان برصغیر غلامی کی آہنی زنجیروں میں ہمیشہ جکڑے رہیں' آخرکار وہ اپنی ناپاک سازشوں میں کامیاب ہو گیا' خلافت کمیٹی اور کانگریس کے درمیان پھر نفاق پڑ گیا' اور نہ صرف نفاق ہی پڑا بلکہ علی برادران کے نظریات کچھ اس طرح تبدیل ہو گئے کہ تحریک خلافت محض برائے نام رہ گئی اور اس کے بعد تھوڑی ہی مدت میں اس کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو گیا' اور اس کے ختم ہوتے ہی مسلمان ایک دفعہ پھر جمود و تغافل کا شکار ہو گئے' ان کا جذبہ حریت سرد ہو گیا' اور وہ جس جگہ سے چلے تھے' منزل مقصود پانے کے بغیر پھر اسی مقام پر واپس آ گئے اور کئے کرائے پر گویا پانی پھر گیا۔ انگریز کامیاب ہو گیا اور ہندوستانی آنکھیں ملتے رہے۔

آزاد کی جرأت و ہمت

یاس و قنوط کے اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں گھر کر بھی مولانا آزاد مایوس نہیں ہوئے' وہ اپنے کام میں جرأت و پامردی سے برابر مصروف رہے اور مسلمانوں کو درس آزادی دینے میں انہوں نے غفلت و تکاہل کو مطلق قریب نہیں آنے دیا' وہ جس ولی اللہی مشن کو لے کر پہلے روز اٹھے تھے' اسی کو انجام تک پہنچانے اور مکمل کرنے کی فکر میں لگے رہے' اور اس کوشش میں انہوں نے دن رات ایک کر دیئے' ہمارے کانوں میں مولانا آزاد کا وہ خطبہ صدارت اب بھی گونج رہا ہے' جو انہوں نے آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس کلکتہ میں "مسئلہ خلافت" پر دیا تھا' یہ دو صد سے زائد صفحات کا خطبہ مسلمانوں کے لیے ایک پیام حریت تھا' جس میں انہوں نے ثابت کر دیا تھا' کہ جس خلافت ارضی کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے' اس کے حق دار صرف اہل اسلام ہی ہیں کوئی دوسری قوم نہیں ہے۔

کانگریس کی صدارت

خلافت کمیٹی کا رخ تبدیل ہو جانے اور پھر اس کے ٹوٹ جانے پر مسلمانوں کا آپ کے مشن سے اتحاد و عمل نہ کرنے سے ناچار مولانا آزاد کو اپنی تحریک حریت کی تکمیل کے لیے کانگریس میں شمولیت اختیار کر کے برق آسا سرگرمیاں دکھانا پڑیں' ان کی سحربیانی اور جادو نگاری نے تو پہلے ہی دوست و دشمن کو ان کا گرویدہ بنالیا تھا' اور ان کے انداز تحریر و تکلم میں سچ مچ کچھ ایسا طلسم بھرا تھا' کہ مخالف و معاند بھی ان کا شیدا و دیوانہ بن جاتا تھا' آپ نے کانگریس کی رکنیت کیا قبول کی' اس کے متعصب راہنماؤں کے دل موہ لئے۔ اور آخرکار ۱۹۲۳ء میں' جب کہ مولانا عمر کی ابھی پینتیسویں بہار دیکھ رہی تھی' آپ کو کانگریس کی صدارت سونپی گئی آپ اس عہدہ پر تقریباً ۲۳ سال یعنی ۱۹۴۶ء تک فائز رہے' اور حصول آزادی کے لیے اپنی زبان و قلم سے انگریز کے ساتھ ایسی چومکھی جنگ لڑی کہ اسے ہندوستان سے اپنا بوریا بستر لپیٹ کر نکلنا ہی پڑا۔

مولانا نے کانگریس میں جا کر اسلام اور اہل اسلام کو ایک لمحہ بھی فراموش نہیں کیا' اور وہاں بھی مسلمانان ہند کو وہی درس حیات اور پیام حریت دیا جو اس سے پہلے دیتے آئے تھے بلکہ ان کی سب سے بڑھ کر یہ کوشش رہی کہ مسلمان جوق در جوق کانگریس میں شامل ہو کر اس پر مکمل قبضہ کر لیں' اور ہندو اکثریت کو اس پر غلبہ نہ پانے دیں' تاکہ آنے والے حالات میں جب شاہد آزادی سے ہمکنار ہونا پڑے' تو زمام حکومت مسلمانوں ہی کے اختیار و قدرت میں ہو' اسی لیے آپ زور شور سے تحریک فرماتے رہے' کہ مسلمان بلا اختلاف عقیدہ و مسلک کانگریس کی رکنیت قبول کریں' اور زیادہ سے زیادہ تعداد میں آ کر اس پر قابض ہو جائیں۔

چنانچہ مولانا کی یہ آواز "صدا بہ صحرا" ثابت نہ ہوئی' بلکہ عوام و خواص کے

دل میں اتر گئی۔ چنانچہ ان کی تحریک پر لبیک کہا گیا' اور مسلمان بھی ذوق و شوق سے کانگریس کے رکن بنتے اور آزادی کی خاموش جنگ لڑتے رہے' حتیٰ کہ ہمارے قائداعظم مسٹر محمد علی جناح مرحوم نہ صرف کانگریس میں شریک ہوئے' بلکہ ایک سرگرم ممبر کی حیثیت سے مصروف عمل رہے' اور ان کے علاوہ اکثر مسلمان اکابرین و راہنمایان قوم اور علمائے اسلام نے بخوشی اس کے ممبر بن کر تحریک حریت میں خوب خوب حصہ لیا۔ قیدیں کاٹیں' مصیبتیں جھیلیں' ماریں کھائیں' چکیاں پیسیں' مشقتیں برداشت کیں' مگر جادۂ منزل سے منہ نہیں موڑا۔

مسلمانوں کی علیحدگی

کچھ مدت کے بعد حالات نے ایک اور پلٹا کھایا' مسلمان جس ذوق و شوق اور کثرت سے کانگریس میں شامل ہوئے تھے' بعض شکوک و شبہات اور بعض شدید اختلافات کی بنا پر اسی کثرت سے کانگریس کو چھوڑنے لگے' اور چند گنے چنے مسلمانوں کے سوا سب نے اس سے علیحدگی اختیار کر لی' سب سے بڑا اختلاف اور شبہ جو ان کے دلوں میں پیدا ہوا یہ تھا' کہ اگر ہندوؤں اور مسلمانوں کے اتحاد عمل سے آزادی جیت لی گئی' تو ہنود اہل اسلام کے حقوق کو پامال کر کے رکھ دیں گے' اور حکومت میں کوئی حصہ انہیں نہیں ملے گا۔ بس یہ شبہ مسلمانوں میں ایک تحریک کی صورت اختیار کر گیا۔ تاآنکہ مسلمانوں کا کانگریس میں شامل رہنا ایک "جرم" قرار پا گیا۔ اور "کانگرسی" کا لفظ بطور گالی استعمال ہونے لگا ...... اور پتہ نہیں کب تک استعمال ہوتا رہے۔

آزاد کی استقامت

مسلمانوں کے اس طرزِ عمل سے مولانا آزاد کو قلق تو بے حد ہوا لیکن

انہوں نے اپنے ساتھیوں کے الگ ہونے سے اپنے مشن اور اپنے طریق کار کو پھر بھی نہیں چھوڑا' وہ یہ یقین رکھتے تھے' کہ مسلمان اگر اپنی عظمت رفتہ کو حاصل کر سکتے ہیں' تو اس کی واحد صورت یہی ہے کہ کانگریس سے وابستہ رہیں' اور اکثریت کے ساتھ متحد ہو کر کام کریں' وہ مسلمانوں کی جدائی کا دکھ تو ضرور محسوس کرتے رہے' اور ان کی غلط فہمیوں پر سرد آہیں بھی بھرتے رہے' لیکن ان حالات میں بھی یاس و قنوط کو انہوں نے نزدیک نہیں آنے دیا۔ ہاں! انہوں نے ایک پیش گوئی ضرور فرمادی۔ اور دردناک لہجہ میں کہا:

> "میری آرزو تھی کہ تمہیں محبت اور قدرت کے ان گلزاروں کی سیر کراؤں جہاں پر غنچہ کی چٹک تمہارے ہونٹوں کے تبسم کا انتظار کرے' اور ہر پھول تمہیں گلہ تنگ دامانی پر مجبور کر دے۔ مگر آہ! ناقدر شناسان حقیقت' تم نے میری آرزو کو ٹھکرایا۔ میری صداؤں پر توجہ نہ دے کر چمن زاروں کے عوض ببولوں پر قناعت کی۔ اور ان سے ایسا دامن الجھایا جو پوری قبائے حیات کو تار تار کر کے چھوڑے گا' غرناطہ و بغداد کی تباہیاں' اسپین کی بربادیاں اور لال قلعہ کی ویرانیاں تمہیں کوئی سبق نہ دے سکیں' تو اب ان حوادث کا انتظار کرو جو تمہیں زندگی کی بجائے موت کا درس دینے آئیں گے' اگر تمہارے جمود کا یہی حال رہا اور تم زمانہ کے نئے تغیر سے آنکھیں پھیر کر بیٹھے رہے' تو جس سرزمین پر آباء کے کاروان عمل پُر جلال انداز سے آئے تھے تم وہاں سے قافلے بنا کر نکلو گے' اور نحوست و مصیبت تمہارے حال پر آنسو بہا کر تمہیں رخصت کرے گی' اس وقت ممکن ہے تم مجھے یاد کرو مگر میں شائد وہاں ہوں گا' جہاں سن تو سکتا ہوں مگر منہ سے کچھ بول نہیں سکتا۔" (الجمعیتہ)

مولانا کی اس حقیقت افروز پیش گوئی پر کوئی تنقید کرنا تحصیل حاصل ہے' صرف یہ دیکھنا چاہیے کہ انہوں نے کس درد دل سے مسلمانوں کے تغافل کی

شکایت کی ہے۔

کانگریس کے اجلاس میں مولانا آزاد کا آوازۂ حق

ہمیں مولانا آزاد کے متعلق یہ الزام سن کر حیرت ہوتی ہے کہ وہ گاندھی اور نہرو کے دباؤ میں آ گئے تھے اور انہوں نے ہندوؤں کو خوش رکھنے کے لئے کانگریس سے وابستگی اختیار کر رکھی تھی۔ لیکن مقام غور ہے کہ وہ شخص جس نے اسلام کی خدمت و اشاعت' حق کی تبلیغ و حمایت اور قرآن و حدیث کی تفسیر و تدریس میں اپنی عمر عزیز صرف کر دی ہو' جس نے انگریز کی ظالم و جابر حکومت کے سامنے کلمۂ حق بلند کیا ہو' اور اسی "جرم" میں جیل میں جانا گوارا کر لیا ہو' وہ کس طرح گاندھی اور نہرو کا خوشامد پسند بن سکتا تھا؟ وہ کیونکر ہندوؤں کے دباؤ میں آ سکتا تھا؟ اور وہ کس طرح اسلامی افکار و نظریات ترک کر کے ہندوؤں کی ہم نوائی اختیار کر سکتا تھا؟ ایں خیال است و محال است و جنوں۔ ایسا اعتراض سو فیصد غلط' سولہ آنے باطل اور قل بہ قل ناسمجھی پر مبنی ہے جس میں حقیقت یا صداقت کا ایک شمہ بھی نہیں۔

اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ آزاد کانگریس سے وابستہ رہے اور آخر تک وابستہ رہے۔ مگر کس لئے وابستہ رہے؟ اپنی عزت' جاہ اور شہرت کے لئے نہیں' بلکہ انگریز کو باہر نکالنے کے لئے' مسلمانوں کو ان کا مقام دلانے کے لئے۔ برصغیر میں اسلام کا پرچم لہرانے کے لئے۔ تفصیلات پیچھے بیان کی جا چکی ہیں ان کے اعادے کی ضرورت نہیں۔ ورنہ ابوالکلام شہرت اور جاہ کا طلبگار نہ تھا۔ شہرت اس کے گھر کی لونڈی اور جاہ اس کے ہاتھ کی چھڑی تھی۔ ابوالکلام کو کسی چیز کی ضرورت نہ تھی۔ اور اس کے برعکس سب کو ابوالکلام کی ضرورت تھی۔ ابوالکلام خوددار تھا۔ غیرت مند تھا۔ باوفا اور باحیا تھا۔ ابوالکلام زیرک' نباض' جہاندیدہ' مستقل مزاج اور استقامت کا پہاڑ تھا۔ وہ برابر اپنے نظریے پر قائم رہا۔

یہ دیکھئے ۱۹۴۴ء کو رام گڑھ میں کانگریس کا اجلاس زور و شور سے ہو رہا ہے' مولانا آزاد بحیثیت صدر اس میں شریک ہیں' مگر سنئے' کہ وہ ہندوؤں کی ترجمانی کرنے اور ہندو فلسفہ سیاست کی تشریح و توضیح کرنے نہیں گئے ہیں بلکہ سب کے دلوں میں اسلام کا سکہ بٹھانے اور اپنے بارے میں شکوک و اوہام کے پردے چاک کرنے تشریف لے گئے ہیں۔ آپ روح پرور خطاب کرتے ہیں اور اعلان فرماتے ہیں کہ:

> "میں مسلمان ہوں اور فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ مسلمان ہوں' اسلام کی تیرہ سو برس کی شاندار روایتیں میرے ورثہ میں آئی ہیں' میں تیار نہیں کہ اس کا چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی ضائع ہونے دوں' اسلام کی تعلیم اسلام کی تاریخ' اسلام کے علوم و فنون' اسلام کی تہذیب میری دولت کا سرمایہ ہے' اور میرا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کروں' بحیثیت مسلمان ہونے کے میں مذہبی و کلچرل دائرے میں اپنی ایک خاص ہستی رکھتا ہوں اور میں برداشت نہیں کر سکتا کہ اس میں کوئی مداخلت کرے۔"
> (الجمعیۃ دہلی)

اس اعلان کے ایک ایک لفظ کو پڑھئے اور غور کیجیے کہ اجلاس میں ہندو ارکان کی اکثریت ہے' اور مسلمان آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں ہیں' مگر مولانا آزاد یہاں اپنے عقیدے اور نظریئے کی کھل کر وضاحت فرما رہے ہیں اور یہاں تک کہہ رہے ہیں کہ "میں برداشت نہیں کر سکتا کہ اس میں کوئی مداخلت کرے۔" اللہ اللہ! کس قدر جرأت مندی اور حق بیانی ہے۔ اب بھی اگر کوئی مولانا موصوف کے اسلام' ایمان اور اخلاص و وفا میں شبہ کرے تو یہ اس کی اپنی مرضی ہے۔ اس کے لئے سوائے دعا کے اور کیا کیا جا سکتا ہے۔

جنوری ۱۹۲۲ء میں برٹش انڈیا گورنمنٹ نے آپ کو "بغاوت" کے الزام میں گرفتار کیا۔ آپ کی یہ گرفتاری بھی کانگریس میں سرگرمیاں دکھانے کی وجہ سے عمل میں آئی ہے' پریذیڈنسی جیل علی پور (کلکتہ) میں آپ پر سنگین مقدمہ چلتا ہے' اس

وقت آپ انگریز مجسٹریٹ کے رو برو جو تاریخی بیان دیتے ہیں اس میں بھی اسلام اور اس کی تعلیمات ہی کو پیش کرتے اور اسی سے اپنی حریت نواز جد و جہد کا جواز ثابت کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:

"ہم مسلمانوں کا جب اپنی قومی گورنمنٹوں کے ساتھ' جن کی اطاعت از روئے شرع ہم پر واجب ہے' ایسا سلوک رہا ہے' تو پھر ایک اجنبی گورنمنٹ کے کارندے ہم سے کیا امید رکھ سکتے ہیں؟ کیا ہندوستان کی "از روئے قانون" قائم شدہ گورنمنٹ ہمارے لیے اس گورنمنٹ سے بھی زیادہ محترم ہے جو از روئے اسلام واجب الاطاعت ہے؟ کیا انگلستان کی بادشاہت اور لارڈ ریڈنگ کی نیابت' عبدالملک کی خلافت اور حجاج بن یوسف کی نیابت سے بھی ہمارے لیے زیادہ مقتدر ہو سکتی ہے؟ اگر ہم اجنبی وغیر مسلم اور قومی مسلم کا عظیم الشان اور شرعی فرق بالکل نظرانداز کر دیں' جب بھی ہم سے صرف یہی امید کی جا سکتی ہے' کہ جو کچھ حجاج بن یوسف اور خالد قسری کی گورنمنٹوں کے لیے کہہ چکے ہیں' وہی کچھ چیمسفورڈ اور ریڈنگ کی گورنمنٹوں کے لیے بھی کہیں۔ ہم نے ان سے کہا تھا' خدا سے ڈرو' کیونکہ تمہارے ظلم سے زمین بھر گئی ہے' یہی ہم آج بھی کہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم اپنی کمزوری اور بے بسی کی وجہ سے آج ہندوستان میں جو کچھ کر رہے ہیں' وہ دراصل اپنے قومی حکمرانوں کے ظلم و جور کے لیے ہمیں بتایا گیا تھا' نہ کہ ایک اجنبی قبضہ و تصرف کے مقابلہ میں۔ اگر برٹش گورنمنٹ کے ارکان اس حقیقت کو سمجھتے تو انہیں تسلیم کرنا پڑتا' کہ مسلمانوں کے تسامح اور درگذر کی حد ہو گئی ہے' اس سے زیادہ وہ اسلام کو برطانیہ کے لیے نہیں چھوڑ سکتے' اسلام نے حکمرانوں کے مقابلہ میں دو طرح کے طرز عمل کا حکم دیا ہے' کیونکہ حالتیں بھی دو مختلف ہیں' ایک ظلم' اجنبی قبضہ و تسلط کا ہے' ایک خود مسلمان حکمرانوں کا

ہے، پہلے کے لیے اسلام کا حکم ہے کہ تلوار سے مقابلہ کیا جائے، دوسرے کے لیے حکم ہے کہ تلوار سے مقابلہ تو نہ کیا جائے لیکن امربالمعروف اور اعلان حق جس قدر بھی امکان میں ہو، ہر مسلمان کرتا رہے۔ پہلی صورت میں دشمنوں کے ہاتھوں قتل ہونا پڑے گا، دوسری صورت میں ظالم حکمرانوں کے ہاتھوں طرح طرح کی اذیتیں او سزائیں جھیلنی پڑیں گی۔ مسلمانوں کو دونوں حالتوں میں دونوں طرح کی قربانیاں کرنی چاہیں اور دونوں کا نتیجہ کامیابی و فتح مندی ہے۔ چنانچہ گذشتہ تیرہ صدیوں میں مسلمانوں نے دونوں طرح کی قربانیاں کیں، اجنبیوں کے مقابلہ میں سر فروشی بھی کی اور اپنوں کے مقابلہ میں صبرو استقامت بھی دکھائی۔ پہلی صورت میں جس طرح ان کی جنگی جدوجہد کوئی مثال نہیں رکھتی اسی طرح دوسری صورت میں ان کی شہری جد و جہد بھی عدیم النظیر ہے۔

ہندوستان میں آج مسلمانوں نے دوسری صورت اختیار کی ہے حالانکہ مطلب ان کا پہلی حالت سے ہے، ان کے لیے جنگی جدوجہد کا وقت آ گیا تھا لیکن انہوں نے نان وائی لنس (عدم تشدد) کا فیصلہ کر کے تسلیم کر لیا ہے کہ وہ ہتھیار سے مقابلہ نہ کریں گے، یعنی صرف وہی کریں گے جو انہیں مسلمان حکومتوں کے ظلم کے مقابلہ میں کرنا چاہیے، بلا شبہ اس طرز عمل میں ہندوستان کی ایک خاص طرح کی حالت کو بھی دخل ہے، لیکن گورنمنٹ کو سوچنا چاہیے کہ اس سے زیادہ بدنصیب مسلمان اور کیا کر سکتے ہیں؟ حد ہو گئی! کہ اجنبیوں کے ظلم کے مقابلہ میں وہ بات کر رہے ہیں، جو انہیں اپنوں کے مقابلہ میں کرنی تھی۔ مسلمانوں کی حق گوئی کا جو نمونہ ان کی قومی تاریخ دکھلاتی ہے وہ تو یہ ہے کہ ایک جابر حکمران کے سامنے ایک حق گو انسان کھڑا ہے، اس پر الزام یہی ہے کہ اس نے حکمران کے ظلم کا اعلان کیا، اس کی پاداش میں اس کا ایک ایک عضو کاٹا جا

رہا ہے۔ لیکن جب تک زبان نہیں کٹ جاتی وہ یہی اعلان کرتی رہتی ہے' کہ حکمران ظالم ہے۔ یہ واقعہ خلیفہ عبدالملک کے زمانے کا ہے' جس کی حکومت افریقہ سے سندھ تک پھیلی ہوئی تھی' تم دفعہ ۱۲۴۔الف کو اس سزا کے ساتھ تول سکتے ہو۔ میں اس درد انگیز اور جانکاہ حقیقت سے انکار نہیں کرتا کہ اس انقلاب کی حالت کے ذمہ دار خود مسلمان ہی ہیں' انہوں نے اسلامی زندگی کے تمام خصائص کھو دیئے اور ان کی جگہ غلامانہ زندگی کے تمام رذائل قبول کر لیے' ان کی موجودہ حالت سے بڑھ کر دنیا میں اسلام کے لیے کوئی فتنہ نہیں۔ جب میں یہ سطریں لکھ رہا ہوں تو میرا دل شرمندگی کے غم سے پارہ پارہ ہو رہا ہے' کہ اسی ہندوستان میں وہ مسلمان بھی موجود ہیں' جو اپنی ایمانی کمزوری کی وجہ سے علانیہ ظلم کی پرستش کرتے ہیں۔ لیکن انسانوں کی بد عملی سے اسلامی تعلیم کی حقیقت نہیں جھٹلائی جا سکتی۔ اسلام کی تعلیم اس کی کتاب میں موجود ہے' وہ کسی حال میں بھی جائز نہیں رکھتی کہ آزادی کھو کر مسلمان (غلامی کی) زندگی بسر کریں۔ مسلمانوں کو مٹ جانا چاہیے یا آزاد رہنا چاہیے' تیسری راہ اسلام میں کوئی نہیں۔" (الجمعیۃ)

لیجیے! مولانا پر مقدمہ چل رہا ہے' اس جرم میں کہ وہ کانگریس کے صدر اور سرگرم ورکر ہیں اور ایک کانگریسی کی حیثیت سے انگریز کے خلاف بغاوت کر رہے ہیں' لیکن مولانا اپنے بیان میں کانگریس اور ہندوؤں اور ہندوستانی قومیت کے متعلق ایک لفظ نہیں کہتے اور صرف اسلام اور اہل اسلام کی ترجمانی فرماتے ہیں' اسلامی تعلیمات کو پیش کرتے ہیں اور اپنی بغاوت کے جواز میں شریعت اسلامیہ ہی سے دلائل دیتے ہیں۔

آزادی پانے سے بہت پہلے مسلمانوں کے دل میں ہندو اکثریت کا خوف سا پیدا ہوا' یا پیدا کیا گیا۔ اور انہیں بزعم خود یہ محسوس ہونے لگا کہ وہ چونکہ اقلیت میں

ہیں، کل کو ہندو اکثریت خدا معلوم ان سے کیا سلوک کرے۔

مولانا آزاد نے یہ کچھ سنا تو کسی مسلم اجتماع میں نہیں بلکہ ایک کانگریسی جلسے میں ہی مسلمانوں سے خطاب فرمایا اور گرج کر کہا:

"ہندو مجارٹی کے عفریت کا خوف بھی اب خدا کے لیے دل سے نکال دیجیے، یہ سب سے بڑا شیطانی وسوسہ تھا، جو مسلمانوں کے قلب میں القا کیا گیا۔ (سنو) طاقت محض تعداد پر نہیں بلکہ اور باتوں پر موقوف ہے۔ اصل شے قوموں کی معنوی قوت ہے جو اس کے اخلاقی کیریکٹر، اس کے اتحاد اور دراصل ہماری اصطلاح میں خشیت الٰہی اور اعمال حسنہ سے پیدا ہوتی ہے۔" (خطبات آزاد)

الغرض اللہ کے اس شیر نے جب بھی آواز نکالی ہے اس میں اسلام ہی کی گونج سنائی دی ہے، ایسی گونج جس سے دین حق کے دشمن کانپ اٹھتے تھے اور انہیں یہ جرأت نہ ہوتی تھی، کہ وہ اسلام اور مسلمانوں پر کوئی ہلکے سے ہلکا حملہ بھی کر سکیں۔ یہ کس قدر دلیری و جرأت مندی ہے، کہ جلسے ہوتے ہیں غیر مسلموں کے، پھر خالص سیاسی۔ اور مولانا ان میں تقریریں کرتے ہیں اسلامی اور شرعی۔ بلاتے ہیں ہندو اور خطاب کرتے ہیں مسلمانوں سے، دعوت دیتے ہیں کانگریس اور سناتے ہیں کتاب و سنت کے احکام۔ پھر ایک ایک فقرۂ تقریر میں آیات قرآنی اور احادیث نبوی پڑھے جاتے اور قرآن کریم کے حوالے دیئے جاتے ہیں، غیر مسلم سامعین مبہوت رہ جاتے ہیں اور ایک لفظ زبان سے نہیں نکال سکتے۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا!

مولانا آزاد اور پاکستان!

یہ ٹھیک ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد برصغیر کی تقسیم کے سخت مخالف تھے، یہ

بھی درست ہے' کہ انہوں نے قائد اعظم مرحوم کے دو قومی نظریہ سے شدید اختلاف کیا یہ بھی صحیح ہے کہ وہ پاکستان کے نام کی ایک الگ مسلم سٹیٹ کا قیام بھی نہیں چاہتے تھے اور اس میں بھی کلام نہیں' کہ وہ مسلم لیگ اور اس کے لیڈروں سے بھی دلی رنجش رکھتے تھے۔

پاکستانی مسلمانوں کے دلوں میں رہ رہ کر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر جب قائد اعظم کے نظریات کے سامنے ہندوستان کے بڑے لیڈروں اور کانگریس کے بڑے راہنماؤں نے گھٹنے ٹیک دیئے' اور مسٹر گاندھی' پنڈت نہرو' اور راجندر پرشاد' راج گوپال اچاریہ' ٹنڈن پنپ ڈھیروں ایسے راہبران ہند نے شکست مان کر ہندوستان کی تقسیم منظور کر لی اور پاکستان کو تسلیم کر لیا' دو قومی نظریہ کو بھی درست سمجھ لیا اور مسلم لیگ سے بھی مفاہمت کر لی' تو مولانا آزاد کیوں ان باتوں کو نہیں مانتے تھے؟ کیا وہ کوئی انوکھے "ہندوستانی" تھے؟ اور کیا وہ سارے ہندوستانیوں سے بڑھ کر "محب وطن" تھے' کہ اپنے دیس کا ایک انچ ٹکڑا بھی مسلمانوں کے حوالے کرنے پر رضامند نہ ہوتے تھے؟ یہ سوال بظاہر بہت پیچیدہ اور بہت ٹیڑھا نظر آتا ہے۔ اور اسی سوال پر مولانا آزاد کو پاکستان میں اچھی نگاہوں سے نہیں دیکھا جاتا رہا' بلکہ ناروا جوش اور ناجائز طیش میں آنے والے پاکستانی تو مولانا کو جلی کٹی ہی نہیں! انہیں بے نقط مغلظات بھی سناتے رہتے تھے اور انہیں پاکستان کا بلکہ مغلوب الغضب ہو کر اسلام اور مسلمانوں کا سخت ترین "دشمن" قرار دیا جاتا تھا۔ لیکن جب کسی صاحب کو ٹھنڈے دل سے مولانا کے نظریات کو سمجھنے کی ضرورت ہو تو کتاب ہذا کے مطالعہ سے آپ کے نظریات معلوم ہو جائیں گے۔ ذرا پچھلے صفحات کو الٹ کر غور سے پڑھیے تمام اعتراضات اور الزامات کا حل موجود نظر آئے گا۔

آفتاب علم و حکمت کا غروب!

آخر ﴿ اِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ فَلَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ﴾ کا اٹل خدائی قانون نافذ ہوا' مولانا آزاد ۱۹/ فروری ۱۹۵۸ء کی صبح کو فالج سے کیا بیمار ہوئے' ہندوستان اور پاکستان کی ساری ملت اسلامیہ ایک گونہ مفلوج ہو گئی' دارو درمان' علاج معالجہ میں کوئی کسر نہ چھوڑی گئی' لیکن وہی ہوا جو ازل سے مقدر تھا' آپ ۲۲ فروری ۱۹۵۸ء رات کے سوا دو بجے داعیٔ اجل کو لبیک کہہ گئے اور اپنے دوستوں اور دشمنوں' یگانوں اور بیگانوں سب کو روتا چھوڑ گئے۔ ﴿ اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ ﴾

بدل آزاد کا مشکل سے ہو گا ہم نشیں پیدا
نہیں ہوتا سدا اس شان کا در ثمیں پیدا

اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلَهُ وَ ارْحَمْهُ وَ بَرِّدْ مَضْجَعَهُ--- آمین یا اِلٰهَ الْعَالَمِيْن

تاریخ ہائے وفات مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ

دریغا رفت امام الہند آزاد — کہ بود در جہاں فضل مجسم!
بمن فرمود سالش روح پاکش — زقید ہست وجود آزاد گشتم
۱۳۷۷ ہجری

ناگہاں ہاتف بگفت از روئے وصل — آہ رخصت شد مدیر الہلال
۱۹۵۸ عیسوی

اے امام الہند جرأت تاجدار حریت — کائنات نیک طینت راہبر ہندوستان
۲۰۱۴ بکری — ۲۰۱۴ بکری
اوج ایواں اے دبیر عیش دیدہ صد دریغ — بے تکلف خاک میں جاکر ہوا تو اب نہاں
۲۰۱۴ بکری — ۲۰۱۴ بکری

صد دریغا اے امام الہند میر قافلہ — ابر سلامتی بر خاکش مدام باد
۱۹۵۸ء — ۱۹۵۸ء

اعوذ باللہ الرزاق من الشیطان الرجیم
۱۹۵۸ء
بسم اللہ الاول الباسط التواب الرحمان الرحیم
امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد وزیر تعلیم ہند
۱۳۷۷ھ
رضی اللہ المهیمن عنہ
۱۳۷۷ھ

مقالات آزاد

مولانا ابوالکلام آزاد کے روح پرور اور انقلاب آفریں مقالات کے منتخب اقتباسات جن سے مقررین، مصنفین اور مدیران جرائد و رسائل استفادہ کر کے اپنی تحریروں اور تقریروں کو چار چاند لگا سکتے ہیں۔

مقالات آزاد

تاویل کتاب و سنت کی نہیں ہوگی قول امام کی ہوگی

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کسی بڑی شخصیت کا قول یا فعل اس معیار کے خلاف نظر آتا ہے تو لوگ فرط اعتقاد سے اس قول یا فعل کی تائید اور نص کتاب و سنت کی تاویل پر اتر آتے ہیں۔ لیکن یہی بنیاد تحریف ہے۔ ہمارا فرض یہ ہونا چاہیے کہ ارشاد الٰہی یا فرمان نبوی کو علیٰ حالہٖ قائم رکھیں اور (اگر ممکن ہو تو) اس بزرگ کے قول یا فعل کی تاویل کریں جیسا کہ حافظ ذہبی نے کہا ہے وَكُلُّ إِمَامٍ يُؤْخَذُ مِنْ قَوْلِهٖ وَيُتْرَكُ إِلَّا إِمَامَ الْمُتَّقِيْنَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ یعنی ہر امام کے قول میں اخذ و ترک سے کام لیا جائے گا۔ بجز امام متقین رسول امین ﷺ کے۔

امام مالک نے اس سے واضح تر انداز میں افادہ فرمایا کہ رسول مقبول ﷺ کے سوا کسی (امام) کا ارشاد نکتہ چینی و تنقید سے بالاتر نہیں ہے۔ (تذکرہ)

حاملین حدیث و سنت کا مقام رفیع

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا۔ "اِرْمُوْهُمْ بِالسُّنَّةِ یعنی ارباب بدع و ہوا پر سنت کے تیر چلاؤ"۔ اس کی روک کے لیے ان کے پاس کوئی ڈھال نہیں۔ اور اسی سے اہل بدعت کی ایک پہچان یہ ہوئی کہ ہمیشہ قرآن کے نام کی آڑ پکڑیں گے 'كَلِمَةُ حَقٍّ أُرِيْدَ بِهَا الْبَاطِلُ اور سنت ماثور سے اعراض کریں گے۔

دوسری جگہ اصحاب حدیث کی مدح میں یوں رقم طراز ہیں:

غرضیکہ موجودہ عہد کی مادیت و مقصودیت کے مقابلے میں صرف اصحاب حدیث و سنت و حاملین علوم و ماثورہ سلف ہی کی جماعت وہ طائفہ منصورہ (کامیاب گروہ) ہے' جس کے لیے کسی طرح کا بیم و ہراس نہیں۔ (تذکرہ)

قرآن و سنت کی حفاظت و صیانت

دنیا میں جس قدر بھی ہدایت و تعلیم کی لوحیں تھیں سب کے لیے تغیر و تبدل ہوا۔ حتیٰ کہ آج کوئی بھی محفوظ نہیں۔ لیکن اللہ اکبر! مقام محمدی کی محفوظیت و مصئونیت کہ اس کی سیرت طیبہ اور حیات حیہ وقائع کی لوح محفوظ کا ایک نقطہ بھی محو نہ ہو سکا۔ اور قرآن محفوظ وَ كِتَابٍ مَّسْطُورٍ فِيْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ اور فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ میں اس کا ایک ایک حرف ایک ایک لفظ اسی طرح نقش و ثبت ہے اور ہمیشہ رہے گا جس طرح قلم ازل نے اول صبح تعین کی کرنوں سے لکھ دیا تھا۔ پس قرآن کے بعد اگر کوئی ہستی "لوح محفوظ" ہو سکتی ہے تو وہ صرف وہی روح اعظم و خالد ہے جس کے ذکر کو خود قرآن نے اپنی آغوش حفظ و صیانت سے ہمیشہ کے لیے لے لیا ہے۔ (تذکرہ)

قرآن و سنت سے بعد و ہجر کا نقصان

یہ کتاب و سنت سے بعد و ہجر اور ترک براہین و یقینیات شرعیہ' و تشبت بہ ظن و تخمین بحث و تخرص و تلعب بہ ظلمات اوہام اہواء و قیاس غیر صالح و غیر موید بالوحی کے شجرۃ الزقوم کے ابتدائی برگ و بار تھے' جو آگے چل کر اس قدر پھلے پھولے کہ علم و عمل کا کوئی گوشہ ان کے ثمرات ردیہ و خبیثہ سے خالی نہ رہا اور وہ شریعت الٰہیہ جس کی نسبت کہا گیا تھا کہ اَلسَّمْحَةُ الْحَنِيفِيَّة و المحجة الْبَيْضَاءُ

لَیْلُھَا کَنَھَارِھَا طرح طرح کے ظنون فاسدہ و آراء مشتتہ و قیاسات متخالفہ و سبل متفرقہ و طرائق قددا و قواعد متناقضہ و تاویل الجاہلین و انتحال المبطلین و حیل المتحیلین و اقیسۃ القیاسین ظُلُمٰتٌ بَعْضُھَا فَوْقَ بَعْضٍ کا مجموعہ بنا دی گئی۔ (تذکرہ)

تفسیر بالرائے کی شکلیں اور نقصانات

ایک بہت بڑی مصیبت "تفسیر بالرائے" سے پیدا ہوئی اس کی ممانعت سے مقصود یہ نہ تھا کہ قرآن کے مطالب سمجھنے میں عقل و بصیرت سے کام نہ لیا جائے۔ اگر یہ مطلب ہو تو قرآن کے درس و مطالعہ کا کوئی فائدہ ہی نہیں رہتا حالانکہ قرآن اول سے آخر تک تعقل و فکر کی دعوت ہے۔ تفسیر بالرائے میں "رائے" مصطلحہ شارع ہے اور اس سے مقصود ایسی تفسیر ہے جو اس لئے نہ کی جائے کہ خود قرآن کیا کہتا ہے اس لئے کی جائے کہ ہماری کوئی ٹھہرائی ہوئی رائے کیا چاہتی ہے' اس نے متعدد شکلیں اختیار کیں مثلاً:

(ا) عقائد میں رد و کد کا سلسلہ چلا تو مذاہب کلامیہ پیدا ہو گئے۔ ہر مذہب کے مناظر کی جستجو یہ نہ تھی کہ قرآن کیا کہتا ہے' ساری کاوش اس کی تھی کہ کسی طرح اس سے اپنے مذہب کی تائید و حمایت کے دلائل پیدا کر لئے جائیں۔

(۲) مذاہب فقہیہ کے مقلدوں میں گروہ بندی کے جذبات تیز ہوئے تو وہ اپنے اپنے مسائل کی تائید میں آیات قرآنیہ کو کھینچنے لگے' یہ فکر نہ تھی کہ لغت عربی کے صاف صاف معنی اسلوب بیان کا قدرتی ملنا اور عقل و بصیرت کے سامنے فیصلہ کیا ہو سکتا ہے' تمام تر کوشش یہ تھی کہ قرآن کو اپنے مذہب کے مطابق کر دکھایا جائے۔

(۳) صوفیا اسرار بطون کی جستجو میں دور تک نکل گئے۔ پھر اپنے موضوع عقائد و مباحث پر قرآن کو ڈھالنے لگے اور قرآن کا کوئی عقیدہ کوئی بیان اس تحریف معنوی سے نہ بچا۔

(۴) ایک گروہ نے قرآن کے مطابق استدلال کو مروجہ منطق کا لباس پہنانا چاہا جہاں کہیں آسمان کواکب' نجوم وغیرہ کے الفاظ آ گئے تو ان پر یونانی علم ہیئت کے مسائل چپکانے شروع کر دیئے۔

(۵) آج کل مصر و ہند کے بعض مدعیان اجتہاد و نظر نے یہ طریقہ اختیار کر لیا ہے کہ زمانہ حال کے اصول علم و ترقی قرآن سے ثابت کئے جائیں یا جدید تحقیقات علمیہ کا اس سے استنباط کیا جائے گویا قرآن صرف اس لیے نازل ہوا تھا کہ جو بات کا پر یکس' نیوٹن' ڈارون اور ویلس نے کسی الہامی کتاب کی فلسفہ اندیشیوں کے بغیر دریافت کر لی اسے چند صدی پہلے معموں کی طرح دنیا کے کان میں پھونک دے اور وہ بھی صدیوں تک دنیا کی سمجھ میں نہ آئے' یہاں تک کہ موجودہ زمانے کی مفسر پیدا ہوں اور تیرہ سو سال کے معمے حل فرمائیں۔ یہ اور اس قسم کی تمام تفسیریں یقیناً تفسیر "بالرائے" ہیں' اور یہی تفسیریں تھیں جن کے اندیشے سے اسلاف کے روحوں پر لرزہ طاری ہوتا تھا۔ (ترجمان القرآن)

صفات الٰہیہ کی ترتیب

آخر میں اتنا اور عرض کر دینا چاہیے کہ سورۃ فاتحہ میں ربوبیت رحمت اور عدالت کی صفتیں جس ترتیب سے بیان ہوئی ہیں یہ فکر انسانی کے طلب و معرفت کی قدرتی منزلیں ہیں۔ سب سے پہلے ربوبیت کا ذکر کیا گیا کیوں کہ کائنات ہستی میں سب سے زیادہ ظاہر نمود اسی صفت کی ہے اور ہر وجود کو سب سے زیادہ اسی کی احتیاج ہے۔ ربوبیت کے بعد رحمت کا ذکر کیا گیا۔ کیونکہ اس کی حقیقت بہ مقابلہ ربوبیت کے مطالعہ و تفکر کی محتاج تھی۔ اور ربوبیت کے مشاہدات سے جب نظر آگے بڑھتی ہے تب رحمت کا جلوہ نمودار ہوتا ہے۔ پھر رحمت کے بعد عدالت کی صفت جلوہ افروز ہوئی کیونکہ یہ سفر کی آخری منزل ہے۔ رحمت کے مشاہدات کی منزل سے جب قدم

آگے بڑھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے یہاں عدالت کی نمود بھی ہر جگہ موجود ہے اور اس لیے موجود ہے کہ ربوبیت اور رحمت کا مقتضا یہی ہے۔ (ترجمان القرآن)

مذھب کے نام پر جھگڑے تباہی کا باعث ہیں

(مولانا فرماتے ہیں) غور کرو۔ مذہب کے نام سے کتنے جھگڑے بنا لئے گئے ہیں جن میں سے ہر جھگڑا فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْأُوْلٰی کی فرعونی صدا کا ٹھیک اعادہ ہے۔ یعنی اب سے پہلے فلاں گروہ جو گزر چکا ہے حق پر تھا یا باطل پر؟ فلاں انسان نیک تھا یا بد۔ پھر اس میں بحثیں ہیں۔ لڑائیاں ہیں۔ فرقہ بندیاں ہیں۔ گویا انسان کی نجات کے لیے کافی نہیں کہ خود اسے کیا کرنا چاہیے' وہ اس فیصلے کا بھی ذمہ دار بنا دیا گیا ہے کہ اب سے پانسو برس پہلے کسی نے کیا کیا تھا۔ اور ایک ہزار برس سے پہلے کون کیسا تھا۔ پھر ہر فریق اس طرح حکم لگاتا ہے گویا خدا کے وقت کا رجسٹر ابھی پڑھ کر اٹھا ہے۔

پچاس برس ہوئے شام میں مسلمانوں کے ایک گروہ نے دوسرے گروہ کی بستیاں صرف اس سے جلا دی تھیں کہ ایک کہتا تھا' حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ سب سے بڑے ولی ہیں۔ دوسرا کہتا تھا نہیں شیخ احمد رفائی۔ ہندوستان کا یہ حال ہے کہ آج تک میرے پاس نہایت سنجیدہ عبارت میں لکھے ہوئے استفتا آتے رہتے ہیں۔ زید کہتا ہے بڑے پیر صاحب سے بڑھ کر کوئی نہیں۔ عمر کہتا ہے مجدد الف ثانی سے بڑھ کر کوئی نہیں۔ نماز کس کے پیچھے جائز ہے ایک مرتبہ میرے جی میں آیا لکھ دوں دونوں کے پیچھے نہیں۔

فقہ کے مذاہب اربعہ جب مشخص و مدون ہو گئے اور تقلید شخصی کا التزام قائم ہو گیا۔ تو سوال پیدا ہوا۔ ان چاروں اماموں میں افضل کون ہے؟ حضرت امام ابو حنیفہ یا حضرت امام شافعی؟ اب بحث شروع ہوئی اور بحث نے جنگ و قتال کی شکل اختیار کی۔ چنانچہ ہلاکو خاں کو اسلامی ممالک پر حملہ کی سب سے پہلے ترغیب خراسانیوں کے

اسی جھگڑے سے ملی تھی۔ حنفیوں نے شافعیوں کی ضد میں آکر بلاوا بھیجا اور شہر کے پھاٹک کھول دیئے۔ پھر جب تاتاریوں کی تلوار چل گئی تو اس نے نہ شافعی کو چھوڑا حنفی کو' فَجَاسُوا خِلاَلَ الدِّيَارِ وَ كَانَ وَعداً مَّفْعُولاً

شیعہ سنی کے اختلافات نے مسلمانوں کو دو مختلف امتوں میں متفرق کر دیا۔ لیکن اس تمام اختلاف کا ماحصل بھی کیا ہے؟ یہی کہ فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰی۔ اور تیرہ سو برس گزر گئے مگر اتنی بات کسی کے سمجھ میں نہیں آئی کہ عِلْمُهَا رَبِّي فِي كِتَابٌ لاَ يَضِلُّ رَبِّي وَلاَ يَنْسٰى (اس بات کا علم میرے پروردگار کے پاس نوشتے میں ہے میرا پروردگار ایسا نہیں کہ کھویا جائے یا بھول میں پڑ جائے۔) بہرحال یاد رکھنا چاہیے کہ اس طرح کی تمام کاوشوں کے اندر وہی فرعون والی مجادلانہ روح کام کیا کرتی ہے۔ اور طریق موسوی یہ ہے کہ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّي فِي كِتَابٍ کہہ کر سارے جھگڑے ختم کر ڈالنا اور دوسرے سے ان کاوشوں میں پڑنا ہی نہیں۔ (ترجمان القرآن ج ۲ ص ۴۶۳' ۴۶۴)

وحی و نبوت ہدایت کا اصل ذریعہ ہے

جس طرح وجدان کی نگرانی کے لیے حواس کی ضرورت تھی۔ اسی طرح حواس کی تصحیح و نگرانی کے لیے عقل کی ضرورت ہوئی۔ حواس کا ذریعہ ادراک محدود بھی ہے۔ اور بعض اوقات یہ غلطی اور گمراہی سے بھی محفوظ نہیں رہتا۔ مثلاً بخار کی حالت میں ہمیں میٹھی چیز بھی کڑوی معلوم ہوتی ہے۔ یا صحرا میں چلتے چلتے محسوس ہوتا ہے کہ سامنے پانی موجزن ہے قریب جائیں تو کچھ بھی نہیں ہوتا۔ جو اس کی درماندگیوں میں عقل ہمیں راستہ دکھاتی ہے۔ ٹھیک اسی طرح ہم وجداناً محسوس کرتے ہیں کہ عقل کی ہدایت کے بعد بھی نگرانی و رہنمائی کا کوئی مرتبہ ہونا چاہیے' کیونکہ عقل کی ہدایت بھی ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھتی۔ یہی چوتھا درجہ

ہدایت ہے جیسے قرآن وحی و نبوت کی ہدایت سے تعبیر کرتا ہے۔ اسے ربوبیت الٰہی کی سب سے بڑی بخشش و مرحمت قرار دیتا ہے۔ یہی وہ خاص ہدایت ہے جسے قرآن "الھدیٰ" کے نام سے پکارتا ہے۔ یعنی ہدایت کی ایک ہی اور حقیقی راہ۔ اسی عالمگیر ہدایت وحی کو وہ "الدین" کے نام سے پکارتا ہے۔ یعنی نوع انسانی کے لیے حقیقی دین۔ اور اس کا نام اس کی زبان میں "اسلام" ہے۔ (ترجمان القرآن)

سیرت طیبہ کا نچوڑ اور خلاصہ

کوئی شخص کتنے ہی مخالفانہ ارادے سے مطالعہ کرے' لیکن تاریخ اسلام کے چند واقعات اس درجہ واضح اور قطعی ہیں کہ ممکن نہیں ان سے انکار کیا جا سکے۔ ازاں جملہ یہ کہ جو جماعتیں پیغمبر اسلام ﷺ کی مخالف تھیں' ان کے تمام کام اول سے لے کر آخر تک ظلم و تشدد' دغا و فریب' وحشیت و خونخواری پر مبنی رہے۔ اور پیغمبر اسلام اور ان کے ساتھیوں نے جو کچھ کیا اس کا ایک ایک فعل صبر و تحمل' راستی و دیانت اور عفو و بخشش کا اعلیٰ سے اعلیٰ نمونہ تھا۔ (پھر پیغمبر اسلام کی سیرت مطہرہ کا خلاصہ پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں) مظلومی میں صبر' مقابلہ میں عزم' معاملہ میں راست بازی' طاقت و اختیار میں درگزر' تاریخ انسانیت کے وہ نوادر ہیں جو کسی ایک زندگی کے اندر اس طرح کبھی جمع نہیں ہوئے۔ (ترجمان القرآن)

علماء و مشائخ کو رب بنانا قبیح جرم ہے

آیت اِتَّخَذُوا اَحْبَارَھُمْ میں اس گمراہی کی طرف اشارہ ہے جو یہود و نصاریٰ کی تمام فکری و عملی گمراہیوں کا سرچشمہ تھی۔ مطلب یہ نہیں کہ یہود و نصاریٰ علماء و مشائخ کو رب السموات والارض کہتے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ یہودیوں نے اپنے فقیہوں اور عیسائیوں نے اپنے پوپ اور اس کے مقرر کیے ہوئے پادریوں کو

دین کے بارے میں جو منصب دے دیا' وہ فی الحقیقت انہیں مثل پروردگار کے بنا لینا ہے۔ عدی بن حاتم طائیؓ نے جو پہلے عیسائی تھے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ ہم علماء مشائخ کو پوجتے تو نہیں۔ آپ نے فرمایا کیا ایسا نہیں کہ جس بات کو وہ حرام ٹھہرا دیتے ہیں تم حرام سمجھ لیتے ہو۔ اور جس بات کو حلال کر دیتے ہیں' حلال مان لیتے ہو یہی انہیں پوجنا ہے۔ عیسائیوں نے پوپوں کو اور یہودیوں نے ربیوں کو کبھی خدا نہیں سمجھا لیکن عملاً حق و باطل' حلال و حرام اور عذاب و ثواب کا اختیار انہیں کو دے دیا۔ اس گمراہی کا نتیجہ یہ نکلا:

(۱) خدا کی کتاب اس غرض سے نازل ہوئی تھی کہ لوگ اسے پڑھیں اور اس پر عمل کریں اس کی جگہ انسانوں کے فیصلے نے لے لی۔

(۲) ہدایت کا مرکز عملاً خدا کا حکم نہ رہا' انسانوں کا حکم ہو گیا۔

(۳) دینی پیشواؤں کا ایک گروہ پیدا ہو گیا' جو لوگوں کو اندھا بہرا بنا کر جس طرح چاہتا اپنے اغراض کے لیے کام میں لاتا۔

(۴) انسان کی عقلی ترقی کی تمام راہیں بند ہو گئیں کیونکہ لوگوں نے اپنی سمجھ بوجھ سے کام لینا چھوڑ دیا۔

(۵) توہم پرستی اور جہل و کوری کا دروازہ کھل گیا۔ کیونکہ چند انسانوں کی رائے کے سوا دوسروں کو اپنی عقل و بینش سے کام لینے کا حق نہ رہا۔

(۶) دینی پیشوا اچھے انسان ہونے کی جگہ بے پناہ دیوتا بن گئے اور اپنے احکام و اعمال میں یک قلم غیر مسئول ہو گئے۔

تقلید نے علم و بصیرت کی راہوں سے دور کر دیا

(مولانا مسیحی دنیا کی سرگزشت کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں) کہ سوچو خود مسلمانوں کا کیا حال ہوا جنہیں اس دعوت کی تبلیغ سپرد کر دی گئی تھی۔ انہوں نے بھی

دینی تشریع کا حق کتاب و سنت کی جگہ انسانی رایوں کے حوالے کر دیا۔ اعتقاداً نہیں عملاً۔ اور سوال یہاں اعتقاد کا نہیں عمل کا ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ تمام مفاسد ظہور میں آ گئے جن کا دروازہ قرآن نے بند کرنا چاہا تھا۔ سب سے بڑا فساد یہ پیدا ہوا کہ صدیوں سے ان کی عقلی ترقی یک قلم رک گئی اور تقلید نے علم و بصیرت کی راہوں سے انہیں دور کر دیا۔ اب حالت کیا ہے؟ یہ کہ ایک طرف مسلمانوں کی معاشرتی و اجتماعی زندگی مختل ہو رہی ہے۔ کیونکہ اس کی ضرورتوں کے مطابق احکام فقہ نہیں ملتے۔ اور شریعت کو فقہ کے مذاہب مدونہ ہی میں منحصر سمجھ لیا گیا ہے۔ دوسری طرف تمام اسلامی حکومتوں نے قوانین شرع پر عمل درآمد ترک کر دیا ہے اور اس کی جگہ یورپ کے دیوان فوجداری قوانین اختیار کرنے لگے ہیں۔ کیونکہ انہوں نے دیکھا کہ دفاتر فقہ وقت کے انتظامی و معاشرتی مقتضیات کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ اور کوئی نہیں جو انہیں بتلائے کہ اللہ کی شریعت کا دامن اس نقص سے پاک ہے۔ اور اگر وہ کتاب و سنت کی طرف رجوع کرتے تو انہیں اس زمانے کے لیے بھی ویسے میں اصلح واوفق قوانین مل جاتے جس طرح پچھلے عہدوں کے لیے مل چکے ہیں۔ فَيَالِلهِ الْمُسْلِمِيْنَ هٰذِهِ الْفَاقِرَه (ترجمان القرآن)

مناقب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم

ان قدوسیوں کے لیے "رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ" کی بشارت نازل ہوئی۔ یقیناً اللہ ان سے خوشنود ہوا کیونکہ ان کے اعمال اللہ کی خوشنودی ہی کے لیے تھے۔ لیکن یہ بات خصوصیت سے کیوں کہی گئی کہ وہ بھی اللہ سے خوشنود ہوئے؟ اس لیے کہ ان کے ایمان و اخلاص کا اصل مقام اس کے بغیر نمایاں نہیں ہو سکتا تھا۔ انسان کسی مقصد کی راہ میں قدم اٹھاتا ہے اور مصیبتوں سے دو چار ہوتا ہے تو دو طرح کی حالتیں پیش آتی ہیں۔ کچھ لوگ جوانمرد اور باہمت ہوتے ہیں۔ وہ بلا تامل

ہر طرح کی مصیبتیں جھیل لیتے ہیں۔ یہ بات نہیں ہوتی کہ مصیبتیں ان کے لیے مصیبتیں نہ رہی ہوں۔

کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جنہیں صرف باہمت نہیں بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ سمجھنا چاہیے۔ ان میں صرف ہمت و جوانمردی نہیں بلکہ عشق و شیفتگی کی حالت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ مصیبتوں کو مصیبتوں کی طرح نہیں جھیلتے بلکہ عیش و راحت کی طرح ان سے لذت و سرور حاصل کرتے ہیں۔ راہ محبت کی ہر مصیبت ان کے لیے عیش و راحت کی ایک نئی لذت بن جاتی ہے۔ اگر اس راہ میں کانٹوں پر لوٹنا پڑے تو کانٹوں کی چبھن میں انہیں ایسی راحت ملے جو کسی کو پھولوں کی سیج پر لوٹ کر نہیں مل سکتی۔ ان کے لئے صرف اس بات کا تصور کہ یہ سب کچھ کسی کی راہ میں پیش آ رہا ہے اور اسکی نگاہیں ہمارے حال سے بے خبر نہیں۔ عیش و سرور کا ایک ایسا بے پایاں جذبہ پیدا کر دیتا ہے کہ اس کی سرشاری میں جسم کی کوئی کلفت اور ذہن کی کوئی اذیت محسوس ہی نہیں ہوتی۔

(ترجمان القرآن)

مقام محمود کی عظمت و انفرادیت

سورۂ بنی اسرائیل کی آیت نمبر ۷۹ میں پیغمبر اسلام ﷺ کو مقام محمود کی بشارت دی گئی ہے اس سے مقصود ایسا درجہ ہے کہ جو عالمگیر اور دائمی ستائش کا مقام ہو۔ یہ آیت اس وقت نازل ہوئی تھی جب پیغمبر اسلام ﷺ کی مکی زندگی کے آخری سال گزر رہے تھے۔ مظلومیت اور بے سرو سامانی انتہا پر پہنچ چکی تھی۔ وحی الٰہی نے محض فتح و کامرانی ہی کی بشارت نہ دی کیونکہ فتح و کامرانی کی عظمت کوئی غیر معمولی عظمت نہ تھی۔ بلکہ ایسے مقام تک پہنچنے کی خبر دی جو نوع انسانی کے لیے آخری بلندی ہے' یعنی حسن و کمال کا ایسا مقام جہاں پہنچ کر محمودیت خلائق کی عالم گیر اور

دائمی عظمت حاصل ہو جائے گی۔ کوئی عہد ہو، کوئی ملک ہو، کوئی نسل ہو، لیکن کروڑوں دلوں میں اس کی ستائش ہو گی۔ ان گنت زبانوں پر اس کی مدحت طرازی ہو گی۔ یہ مقام انسانی عظمت کی انتہا ہے اس سے زیادہ اونچی جگہ اولاد آدم کو نہیں مل سکتی۔ اس سے بڑھ کر انسانی رفعت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ انسان کی سعی و ہمت ہر طرح کی بلندیوں تک اڑ جا سکتی ہے۔ لیکن یہ بات نہیں پا سکتی کہ روحوں کی ستائش اور دلوں کی مداحی کا مرکز بن جائے۔ سکندر کی ساری فتوحات خود اس کے عہد و ملک کی ستائش اسے نہ دلا سکیں۔ اور نپولین کی ساری جہاں ستانیاں اتنا بھی نہ کر سکیں کہ کورسیکا کے چند غدار باشندوں ہی میں اسے محمود و ممدوح بنا دیتیں جہاں وہ پیدا ہوا تھا۔ محمودیت اسی کو حاصل ہو سکتی ہے۔ جس میں حسن و کمال ہو۔ کیونکہ روحیں حسن ہی سے عشق کرتی ہیں اور زبانیں کمال ہی کی ستائش میں کھل سکتی ہیں۔ لیکن حسن و کمال کی مملکت وہ مملکت نہیں جسے شہنشاہوں اور فاتحوں کی تلواریں مسخر کر سکیں۔ غور کرو جس وقت سے نوع انسانی کی تاریخ معلوم ہے۔ نوع انسانی کے دلوں کا احترام اور زبانوں کی ستائش کن انسانوں کے حصے میں آتی ہیں؟ شہنشاہوں اور فاتحوں کے حصے میں یا خدا کے ان رسولوں کے حصے میں جنہوں نے جسم و ملک کو نہیں روح و دل کو فتح کیا تھا؟ (ترجمان القرآن)

دعوت حق کا بہترین طریقہ

سورۂ نحل کی آیت ۱۲۵ میں دعوت حق کا طریقہ بیان کرتے ہوئے تین چیزیں کہی گئی ہیں۔

اول حکمت یعنی دانائی کی باتیں۔

دوم موعظہ حسنہ یعنی پند و نصیحت کی باتیں جو حسن و خوبی سے کی جائیں۔

سوم وَ جَادِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ یعنی بحث و نزاع کی ضرورت پڑے تو کر

سکتے ہو۔ لیکن اچھے طریقے پر' دعوت حق کا طریقہ حکمت اور موعظہ حسنہ کا طریقہ ہے۔ اور بحث و نزاع کی اجازت صرف اس صورت میں ہے۔ کہ احسن طریقے پر ہو۔ احسن طریقہ سے مقصود کیا ہے یہ کہ مقصود طلب حق ہو۔ اپنی بات کی پچ نہ ہو۔ مخالف کے اندر یقین پیدا کرنا ہو۔ اسے باتوں سے ہرانا نہ ہو۔ اگر وہ چپ ہو گیا اور دل کا کانٹا نہ نکلا تو بحث سے کیا فائدہ ہوا؟ یہ بھی ضروری ہے کہ طریق خطاب مخالف کے دل کو دکھ پہنچانے والا نہ ہو۔ اسے دوسروں کی نظروں میں ذلیل و رسوا نہ کرے۔ بد قسمتی سے دنیا میں طلب حق کی راہ بھی محض جدل و نزاع کی راہ بن گئی ہے ہم اپنے دنیوی اغراض و مقاصد کے لیے لڑنے جھگڑنے کے عادی ہیں جب کبھی ایسا جھگڑا پیش آجاتا ہے تو صرف اپنی جیت ہی کے لیے لڑتے ہیں۔ اس خیال سے نہیں لڑتے کہ حق و انصاف کیا ہے کم از کم دین کے معاملے میں ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ دین کی راہ لین دین کی راہ نہیں سچ کو سچ مان لینے کی راہ ہے۔ مصیبت یہ ہے کہ ہم نے سچائی کے کام کو بھی جھوٹ کا کاروبار بنا دیا ہے۔

(ترجمان القرآن)

اسلام سیدھا سادہ اور سچا راستہ ہے

دین حقیقی کی راہ کا سیدھا ہونا اور سبل متفرقہ ---- یعنی خود ساختہ گروہ بندیوں کا پر پیچ و خم ہونا ایک ایسی حقیقت ہے جسے ہر انسان بغیر کسی عقلی کاوش کے سمجھ لے سکتا ہے۔ خدا کا دین اگر انسان کی ہدایت کے لیے ہے تو ضروری ہے کہ خدا کے تمام قوانین کی طرح یہ بھی صاف اور واضح ہو۔ اس میں کوئی راز نہ ہو' کوئی پیچیدگی نہ ہو' ناقابل حل معمہ نہ ہو' اعتقاد میں سہل ہو اور عمل میں ہلکا۔ ہر عقل اسے بوجھ لے' ہر طبیعت اس پر مطمئن ہو جائے۔

اچھا اب غور کرو یہ تعریف کس راہ پر صادق آتی ہے؟ ان راہوں پر جو پیروان

مذہب نے الگ الگ گروہ بندیاں کر کے نکالی ہیں یا اس ایک ہی راہ پر جسے قرآن اصل دین کی راہ بتلاتا ہے؟

(تفسیر ام الکتاب از ابوالکلام آزادؒ)

دو طرح کے انسان

ہم دیکھتے ہیں دنیا میں فلاح و سعادت سے محروم آدمی ہمیشہ دو ہی طرح کے ہوتے ہیں: جاہد اور جاہل۔

جاہد وہ ہوتا ہے جو حقیقت پالیتا ہے بایں ہمہ اس سے روگردانی کرتا ہے۔

جاہل وہ ہوتا ہے جو حقیقت سے نا آشنا ہوتا ہے اور اپنے جہل پر قانع ہو جاتا ہے .... جہاں تک مذہبی صداقت کا تعلق ہے دونوں طرح کی محرومیوں کی مثالیں قوموں کی تاریخ میں موجود ہیں۔ کتنی ہی قومیں ہیں جن کے قدم صراط مستقیم پر استوار ہو گئے ہیں اور فلاح و سعادت کی تمام نعمتیں بھی ان کے لیے مہیا تھیں بایں ہمہ انہوں نے روگردانی کی اور راہ حق کی معرفت حاصل کر کے پھر اس سے منحرف ہو گئے .... اسی طرح کتنی ہی جماعتیں ہیں جن کے سامنے فلاح و سعادت کی راہ کھول دی گئی' لیکن انہوں نے معرفت کی جگہ جہل اور روشنی کی جگہ تاریکی پسند کی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ راہ حق نہ پا سکے اور نامرادی و محرومی کی وادیوں میں گم ہو گئے۔

(تفسیر ام الکتاب از ابوالکلام آزادؒ)

قرآن کے تین اصول جو وجہِ نزاع بنے ہوئے تھے

(۱) قرآن مذہبی گروہ بندی کی روح کا مخالف تھا اور دین کی وحدت یعنی ایک ہونے کا اعلان کرتا تھا۔

(۲) قرآن کہتا تھا' نجات دہندہ اور سعادت کا دارومدار اعتقاد و عمل پر ہے' نسل'

قوم گروہ بندی اور ظاہری رسم ریت پر نہیں۔

(۳) وہ کہتا تھا کہ اصل دین خدا پرستی ہے۔ اور خدا پرستی یہ ہے کہ خدا کی براہ راست پرستش کی جائے۔ لیکن پیروان مذہب نے کسی نہ کسی شکل میں شرک و بت پرستی کے طریقے اختیار کر لیے تھے۔

(تفسیر ام الکتاب)

قرآن کا پیروان مذہب سے مطالبہ

(قرآن مجید) ہر گروہ سے یہی مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اپنے اپنے مذہب کی حقیقی تعلیم پر جسے تم نے طرح طرح کی تحریفوں اور اضافوں سے مسخ کر دیا ہے سچائی کے ساتھ کاربند ہو جاؤ۔

وہ کہتا ہے اگر تم نے ایسا کر لیا تو میرا کام پورا کر دیا کیونکہ جونہی تم اپنے مذاہب کی حقیقی تعلیم کی طرف لوٹو گے تمہارے سامنے وہی حقیقت آموجود ہو گی جس کی طرف میں تمہیں بلا رہا ہوں۔ میرا پیام کوئی نیا پیام نہیں' وہ قدیم اور عالمگیر پیام ہے جو تمام بانیان مذہب دے چکے ہیں۔

(تفسیر ام الکتاب)

قرآن معروف کا حکم دیتا ہے منکر سے روکتا ہے

(قرآن مجید کہتا ہے) جہاں تک اعمال کا تعلق ہے میں انہیں باتوں کے کرنے کا حکم دیتا ہوں جن کی اچھائی عام طور پر جانی بوجھی ہوئی ہے۔ اور انہیں باتوں سے روکتا ہوں جن سے عام طور پر نوع انسانی نے انکار کیا ہے۔ یعنی میں معروف کا حکم دیتا ہوں' منکر سے روکتا ہوں۔

(تفسیر ام الکتاب)

اسلام دین فطرت ہے

وہ (قرآن مجید) کہتا ہے یہی راہ عمل (اسلام) نوع انسانی کے لیے خدا کا ٹھہرایا ہوا فطری دین ہے۔ اور فطرت کے قوانین میں تبدیلی نہیں ہو سکتی یہی اَلدِّینُ الْقَیِّمُ ہے یعنی سیدھا اور درست۔ جس میں کسی طرح کی کجی اور خامی نہیں۔ یہی دین حنیف ہے جس کی دعوت حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دی۔ اسی کا نام میری اصطلاح میں "الاسلام" ہے۔ یعنی خدا کے ٹھہرائے ہوئے قوانین کی پابندی۔ (تفسیر ام الکتاب)

تفرقہ اور گروہ بندی سے بچیں

وہ (قرآن مجید) جب کہتا ہے "الاسلام" کے سوا کوئی دین اللہ کے نزدیک مقبول نہیں' تو اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ دین حقیقی کے سوا جو ایک ہی ہے اور تمام رسولوں کی مشترک تعلیم ہے۔ انسانی ساخت کی کوئی بھی گروہ بندی مقبول نہیں ...... وہ اسی لیے تمام پیروان دعوت کو متنبہ کرتا ہے کہ دین میں تفرقہ اور گروہ بندی سے بچیں اور اس گمراہی میں مبتلا نہ ہو جائیں جس سے قرآن نے نجات دلائی ہے۔

وہ کہتا ہے میری دعوت نے تمام انسانوں کو جو مذہب کے نام پر ایک دوسرے کے دشمن ہو رہے ہیں خدا پرستی کی راہ میں اس طرح جوڑ دیا کہ ایک دوسرے کے جانثار بھائی بن گئے۔ ایک یہودی جو پہلے حضرت مسیحؑ کا نام سنتے ہی نفرت سے بھر جاتا تھا' ایک عیسائی جو ہر یہودی کے خون کا پیاسا تھا' ایک مجوسی جس کے نزدیک تمام غیر مجوسی ناپاک تھے' ایک عرب جو اپنے سوا سب کو انسانی شرف و محاسن سے تہی دست سمجھتا تھا' ایک صابی جو یقین کرتا تھا کہ دنیا کی ہر قدیم سچائی صرف اسی کے حصہ میں آئی ہے ان سب کو دعوت قرآنی نے ایک صف میں کھڑا کر دیا ہے۔

(تفسیر ام الکتاب)

قرآن کا نظریہ توحید

وہ (قرآن مجید) کہتا ہے کہ ہر طرح کی عبادت اور نیاز کی مستحق صرف خدا ہی کی ذات ہے پس اگر تم نے عجز و نیاز کے ساتھ کسی دوسری ہستی کے آگے سر جھکایا' تو توحید الٰہی کا اعتقاد باقی نہ رہا۔ وہ کہتا ہے یہ اسی کی ذات ہے جو انسانوں کی پکار سنتی اور ان کی دعائیں قبول کرتی ہے۔ پس اگر تم نے اپنی دعاؤں اور طلب گاریوں میں کسی دوسری ہستی کو بھی شریک کر لیا تو گویا تم نے اسے خدا کی خدائی میں شریک کر لیا۔

وہ (قرآن مجید) کہتا ہے' دعا' استعانت' رکوع' سجود' عجز و نیاز' اعتماد و توکل' اور اس طرح کے تمام عبادت گزارانہ اور نیاز مندانہ اعمال' وہ اعمال ہیں جو خدا اور اس کے بندوں کا باہمی رشتہ قائم کرتے ہیں۔ پس اگر ان اعمال میں تم نے کسی دوسری ہستی کو بھی شریک کر لیا تو خدا کے رشتۂ معبودیت کی یگانگی باقی نہ رہی۔ اسی طرح عظمتوں' کبریائیوں' کارسازیوں اور بے نیازیوں کا جو اعتقاد تمہارے اندر خدا کی ہستی کا تصور پیدا کرتا ہے' وہ صرف خدا ہی کے لیے مخصوص ہونا چاہیے۔ اگر تم نے ویسا ہی اعتقاد کسی دوسری ہستی کے لیے بھی پیدا کر لیا تو تم نے اسے خدا کا ند یعنی شریک ٹھہرا لیا۔ اور توحید کا اعتقاد درہم برہم ہو گیا۔

(تفسیر ام الکتاب)

دماغی ترقی کی راہ میں سب سے بڑی روک

انسان کی دماغی ترقی کی راہ میں سب سے بڑی روک' اس کے تقلیدی عقائد ہیں اسے کوئی طاقت اس طرح جکڑ بند نہیں کر دے سکتی' جس طرح تقلیدی عقائد زنجیریں کر دیا کرتی ہیں۔ وہ ان زنجیروں کو توڑ نہیں سکتا' اس کہ توڑنا چاہتا ہی نہیں۔ وہ انہیں زیور کی طرح محبوب رکھتا ہے۔ ہر عقیدہ' ہر عمل' ہر نکتۂ نگاہ' جو اسے

خاندانی روایات اور ابتدائی تعلیم و صحبت کے ہاتھوں مل گیا ہے۔ اس کے لیے ایک مقدس ورثہ ہے وہ اس ورثہ کی حفاظت کرے گا مگر اسے چھوڑنے کی جرأت نہیں کرے گا...... شک کا سب سے پہلا کانٹا جو خود بخود دل میں چبھا وہ اسی تقلید کے خلاف تھا...... بار بار یہی سوال سامنے ابھرنے لگا تھا کہ تقلید کی بنیاد علم و نظر پر ہونی چاہیے' تقلید اور توارث پر کیوں ہو؟ .... موروثی اور روایتی عقائد کی پوری دیوار صرف تقلید ہی کی بنیادوں پر استوار ہوتی ہے۔

(غبار خاطر)

اصل مرکز حق و یقین

اصل مرکز حق و یقین کتاب و سنت ہے۔ یہ مرکز اپنی جگہ سے نہیں ہل سکتا سب کو اس کی خاطر اپنی جگہ سے ہل جانا پڑے گا۔ اس چوکھٹ کو کسی کی خاطر نہیں چھوڑا جا سکتا' سب کی چوکھٹیں اس کی خاطر چھوڑ دینی پڑیں گی۔ لَا یُؤمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْهِ مِنْ وَّالِدِہٖ وَ وَلَدِہٖ وَ النَّاسِ اَجْمَعِیْنَ

جب نص رسول کے مقابلہ میں کسی دوسرے انسان کی پاسداری کی تو رسول اَحَبَّ (یعنی سب سے زیادہ محبوب) کب باقی رہا؟ ارباب افراط و غلو کی ساری غلطی یہ ہے کہ وہ اپنے غیر معصوم پیشواؤں کے اقوال و احوال کو بمنزلہ اصل مرکز بنا لیتے ہیں جس کو کسی حال میں اس کی جگہ سے ہلایا نہیں جا سکتا۔ اور پھر چاہتے ہیں کہ وحی الٰہی اور صاحب وحی کی نص کو اس کی جگہ سے ہٹا کر اپنے خود ساختہ مرکز تک لے جائیں اور نہ جا سکے تو زبردستی کھینچ کر لے جائیں۔ اس پر ستم یہ کہ اس طریق کو "توفیق و تطبیق" کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ اگر یہ "تطبیق" ہے وَالَّذِی نَفْسِی بِیَدِہٖ پھر دنیا میں تحریف کا وجود باقی نہ رہا۔ اور نہ کبھی اہل کتاب نے اس دنیا میں تحریف کی۔

(تذکرہ)

درازدستی ایں کوتہ آستیناں بیں

ناواقف "عِنْدَ اَبِی حَنِیْفَةَ" دیکھ کر دھوکا کھا جاتا ہے اور سمجھتا ہے کہ یہ فرع بعینہٖ امام ابو حنیفہؒ کا مذہب ہے۔ جب مسئلہ عشرفی العشر اور تحریم اشارۃ فی التشہد و کراہت رفع الیدین عند الرکوع و کراہت آمین بالجہر و اقتداء خلف مخالف و عدم وجوب طمانیت و وجوب لزوم و تعین وغیرہا کی نسبت صاف دیکھ رہے ہیں کہ صریح تصریحات کتب اصول (مراد کتب اصول فقہ نہیں بلکہ ظاہر الروایت وغیرہ کتب امہات) و موطا و جامع وغیرہ کے خلاف لکھا جا رہا ہے۔ حتیٰ کہ بعض کوتہ آستیناں فقاہت کی درازدستیاں یہاں تک بڑھیں کہ رفع الیدین عند الرکوع اور اشارہ فی التشہد کو فعل کثیر کہتے ہوئے بھی نہ شرمائے۔ تو پھر اور باتوں کے لیے ان کا ہاتھ پکڑنے والا کون تھا؟ "درازدستی ایں کوتہ آستیناں بیں۔"

(تذکرہ)

فقہی قواعد کی حقیقت

جوں جوں سنت کے معارضات بڑھتے گئے اور بحث و مناظرہ کا بیان وسیع ہوتا گیا' ساتھ ساتھ نئے اصول و قواعد بھی بنتے گئے۔ کہ اگر قاعدہ بن گیا تو ایک ہی ڈھال پر سارے وار روک لئے جائیں گے۔ حالانکہ حضرت امام ابو حنیفہ اور صاحبین رحمھم اللہ کو ان اختراعی اصول و قواعد کا وہم و خیال بھی نہ گزرا ہو گا۔ ان کی تصریحات بینہ ان کے خلاف موجود (ہیں)۔ الخاص مبین۔ .... تو ان میں سے کون سا قاعدہ ہے جو حضرت امام ابو حنیفہؒ یا صاحبینؒ کا ٹھہرایا ہوا ہے؟ لیکن یہ سب کچھ ان کی جانب منسوب ہے۔

ارباب فقہ کا ایک خطرناک قاعدہ

بعض دانش مندوں نے تو ایک ہی قاعدہ بنا کر سارے جھگڑے چکا دیے اِذَا کَانَ فِی الْمَسْئَلَةِ قَوْلٌ لِأَبِی حَنِیْفَةَ وَ صَاحِبَیْهِ وَ حَدِیْثٌ یَحْکُمُوْنَ بِصِحَّتِهٖ وَ جَبَ اتِّبَاعُ قَوْلِهِمْ دُوْنَ الْحَدِیْثِ ...... یعنی اگر کسی مسئلہ میں حدیث صحیح ایک طرف ہو اور دوسری طرف اس کے خلاف امام ابو حنیفہ اور صاحبین کا قول' تو واجب ہے کہ حدیث کو چھوڑ دیا جائے اور قول امام ہی کی پیروی کی جائے کیونکہ آخر کوئی بات تو ہو گی' جس کی وجہ سے انہوں نے ایسا کیا؟[1]

تو کیا یہ قاعدہ بھی اسی وجود گرامی کا قرار دادہ ہو سکتا ہے؟ جس نے اپنی ساری عمر مقدس اس صدائے حق کے اعلان و تکرار میں بسر کر دی "اُتْرُکُو قَوْلِی بِخَبْرِ الرَّسُوْلِ" اور کیا اس طرح کے قواعد کا ان لوگوں کو گمان بھی گزر سکتا تھا جن کا عقیدہ یہ تھا کہ "اِذَا صَحَّ الْحَدِیْثُ فَهُوَ مَذْهَبِی" "فَاضْرِبُوا بِقَوْلِی الْحَائِطَ"؟[2]

اہل فقہ کی حیلہ جوئیاں

ایک صاحب نے مجھ سے ایک مولوی صاحب کی نسبت' کہ مدرس بھی ہیں

---

[1] اس نظریے پر ہم سوائے انا للہ کے اور کیا پڑھ سکتے ہیں۔ (فاروقی)

[2] یہ تینوں ارشادات گرامی حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے ہیں جن کے علی الترتیب معنی یہ ہیں: "میرے قول کو بمقابلہ حدیث نبوی چھوڑ دو"۔ "جب کوئی حدیث صحیح ثابت ہو جائے تو وہی میرا مذہب ہے"۔ "حدیث سے متصادم میرے قول کو دیوار پر دے مارو"۔ لیکن ان اقوال پر عمل بجالانے کی بجائے ارباب تقلید و جمود نے خود ان اقوال کی تاویلات کر ڈالیں۔ خود نہیں بدلے' باقی ہر چیز کو بدل کر رکھ دیا۔ (فاروقی)

واعظ بھی ہیں اور جدل و مکابرات کے رسائل کے مصنف بھی' بیان کیا کہ وہ ہر سال اپنا اندوختہ بیوی کے نام ہبہ کر دیتے ہیں۔ اور پھر وہ نیک بخت اسی کا رد عمل کرتی ہے۔[1] ان کے استاد جناب مولانا محمود الحسن صاحب دیوبندی نے یہ سنا تو ایسا کرنے سے روکا کہ تقویٰ کے خلاف ہے۔ میں نے یہ سن کر کہا کہ تقویٰ تو ایک مزید درجہ' علم فضیلت ہے اس کا یہاں ذکر ہی کیا؟ یوں کہنا چاہیے کہ سرے سے دین و شریعت کے ہی خلاف ہے۔ اور ایک نہایت غلیظ قسم کا باطنی فسق۔ اور کامل قسم کی یہودیت۔ اور اصحاب السبت کے شجرۂ ضلالت سے پورا پورا استلحاق۔

(تذکرہ)

علمائے سوء کی مذمت

(مولانا آزادؒ علمائے سوء کو بہت ناپسند کرتے تھے۔ آپ ان کے بھیانک چہرے سے "تقدس" کا پردہ الٹتے ہوئے کہتے ہیں)۔

سانپ اور بچھو ایک سوراخ میں جمع ہو جائیں گے لیکن علماء دنیا پرست کبھی ایک جا اکٹھے نہیں ہو سکتے۔ کتوں کا مجمع ویسے تو خاموش رہتا ہے لیکن ادھر قصائی نے ہڈی پھینکی اور ادھر ان کے پنجے تیز اور دانت زہر آلود ہو گئے۔ یہی حال ان سگان دنیا کا ہے ساری باتوں میں متفق ہو جا سکتے ہیں لیکن دنیا کی ہڈی جہاں سڑ رہی ہو' وہاں پہنچ کر اپنے پنجوں اور دانتوں پر قابو نہیں رکھ سکتے ان کا سرمایۂ ناز علم حق نہیں ہے

---

[1] یہ ایک دیوبندی مولوی صاحب (خدا ان کی مغفرت فرمائے) کے حیلۂ زکوٰۃ پر عمل کا ذکر ہے اس بہانے وہ زکوٰۃ ادا کرنے سے رہائی حاصل کر لیتے تھے کیونکہ فقہ حنفیہ میں حیلے بہانوں کا جواز ملتا ہے۔ اور چونکہ مرحوم مولانا حنفی المذہب تھے بنابریں انہوں نے اس پر عمل فرمایا۔ یہی وجہ ہے جو حضرت شیخ الہندؒ نے تحمل فرمایا اور بہت نرم جملہ ارشاد فرمایا کہ تقویٰ کے خلاف ہے۔

جو تفرقہ مٹاتا اور اتباع سبل متفرقہ کی جگہ ایک ہی صراط مستقیم پر چلاتا ہے' بلکہ یکسر علم جدل و خلاف ہے۔ نفس پرستی اس کی کثافت کو خمیر کر دیتی اور دنیا طلبی کی آگ اس کی نیکی کے بخارات کو اور زیادہ تر کرتی رہتی ہے۔ فساق و فجار خرابات میں بھائیوں کی طرح ایک دوسرے کی تندرستی کا جام صحت پیتے ہیں اور چور اور ڈاکو مل جل کر رہزنی کرتے ہیں' مگر یہ گروہ خدا کی مسجد اور زہد و عبادت کے صومعہ اور خانقاہ میں بیٹھ کر بھی متحد و یکدل نہیں ہو سکتا۔ اور ہمیشہ ایک دوسرے کو درندوں کی طرح چیرتا پھاڑتا اور پنجہ مارتا رہتا ہے۔ میکدوں میں محبت کے ترانے اور پیار و الفت کی باتیں سننے میں آ جاتی ہیں۔ مگر عین محراب مسجد کے نیچے پیشوائی و امامت کے لیے ان میں سے ہر ہاتھ دوسرے کی گردن پر بڑھتا ہے۔ خونخواری کی ہر آنکھ دوسرے بھائیوں کے خون پر لگی ہوتی ہے۔ حضرت مسیحؑ نے احبار یہود سے فرمایا تھا "تم نے داؤد کے گھر کو ڈاکوؤں کا بھٹ بنا دیا ہے"۔ ڈاکوؤں کے بھٹ کا حال تو نہیں معلوم' لیکن ہم نے مسجدوں کے صحن میں بھیڑیوں کو ایک دوسرے پر غراتے اور خون آشام دانت مارتے دیکھا ہے۔"۔

(تذکرہ)

یَهُودُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ [1]

مولانا آزادؒ ایک دوسرے مقام پر علمائے سوء کی نفس پرستی اور حق فراموشی کا دکھڑا یوں سناتے ہیں:

"جو لوگ گزر چکے ہیں ان کی نسبت اب کیا کہا جائے کہ ان کا معاملہ اللہ کے ہاتھ ہے ...... مگر غور و فکر کرو کہ ہر زمانے میں علماء دنیا کی نفس پرستی اور حق فراموشی

---

[1] معنی ہے اس امت کے یہودی۔

کس طرح دنیا کے لیے ایک لعنت رہی ہے۔ اور حیات چند روزۂ دنیوی کے عشق و تعبد نے اس طائفہ عبید الدنیا سے کس کس طرح کتمان حق کرایا ہے .... کیا نوع انسانی کی کوئی بدتر سے بدتر اور گمراہ سے گمراہ قسم بھی اس سے زیادہ دنیا کو نقصان پہنچا سکتی ہے؟ اور کیا جنگل کا کوئی ڈاکو اور کمین گاہوں کا کوئی رہزن اس سے زیادہ جمعیت بشری کے لیے مخدوش و مہلک ہو سکتا ہے؟ اگر علماء کے خصائل کا یہ حال ہے تو اس کے بعد عامہ ناس کے لیے فسق و عدوان کا کون سا درجہ باقی رہ گیا؟ یہی وہ کتمان حق ہے یعنی حق کو دانستہ چھپانے کے لعنت ہے جو علماء یہود پر چھا گئی تھی اور منجملہ اسباب مغضوبیت یہود ہوئی وَ اِنَّ كَثِيراً مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ [1] اور افسوس کہ یہی حال شبر بشر اور ذراع بذراع اس امت کے علماء سوء کا بھی ہوا۔ وَهُمْ يَهُوْدُ هٰذِهِ الْأُمَّة [2] ان کو بہرحال اپنی گنبد دستار کی تعمیر کے لیے اینٹیں چاہئیں اگرچہ خانہ شرع کی دیواریں توڑ کر بہم پہنچائی جائیں ؎

خانہ شرع خدا بست کہ ارباب صلاح
در عمارت گری گنبد دستار خوداند

(تذکرہ)

حیل و مکائد کی آڑ

حضرت موصوفؒ بعد ازاں دور موجودہ کا نقشہ کچھ ان الفاظ میں کھینچتے ہیں:

"آج جو حالت ہو رہی ہے اس کو دیکھئے تو ہوش گم اور عقل درماندہ رہ جاتی ہے۔ آج امت کا ایک فاسق سے فاسق گروہ بھی شاید کبھی سچائی کی خاطر کچھ نقصان

---

[1] ترجمہ یہ ہے "ان میں سے اکثر جانتے بوجھتے حق چھپاتے ہیں"۔

[2] یہ حدیث صحیح کے الفاظ ہیں کہ حق کو پردۂ اخفاء میں رکھنے والے علماء اس امت کے یہود ہیں۔

حال و مال اٹھا لے' اور اس کو اپنے گناہوں کا کفارہ سمجھے۔ لیکن مدعیان علم و مشیخت اور زہد فروشان سجادۂ طریقت سے اتنی بھی امید نہیں! علمائے وقت نے امربالمعروف و نہی عن المنکر کے فرض کو عملاً شریعت کے احکام و واجبات سے خارج کر دیا ہے۔ اور یا تو اب یہ لفظ قرآن کی سورتوں میں کبھی نظر آتے ہیں یا اصحاب سنت کے ابواب و اوراق میں حق کی بے کسی و مظلومی اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ جنگل میں بھیڑوں اور بکریوں کے لیے چرواہا نظر آ جاتا ہے لیکن حق کے لیے کوئی غمگسار مددگار نہیں۔

شاید تم کو اس جملہ پر تعجب ہو کہ علمائے وقت نے امربالمعروف کے فرض کو فرائض شریعت سے خارج کر دیا ہے' لیکن جو حالت ہو رہی ہے اس کے لحاظ سے تو یہ جملہ بھی کافی نہ تھا۔ اگر ایک شخص اپنا عقیدہ ظاہر کرے کہ نماز فرض ہے اور ہر وقت شرح وقایہ کی کتاب الصلوٰۃ اپنی بغل میں رکھے' لیکن عملاً نماز نہ پڑھے اور ترک صلوٰۃ کے لیے طرح طرح کے ایسے حیلے اور عذرات پیش کر دیا کرے جو کبھی اور کسی حال میں بھی دور نہیں ہو سکتے تم اس کی نسبت کیا کہو گے؟ اس کے لیے نماز ایک شرعی حکم واجب العمل رہا یا نہیں؟ یہی حال آج علمائے سو کا بھی ہو رہا ہے۔ اور امربالمعروف اور قیام حق کے حکم سے اپنے آپ کو بری کرنے کے لیے بالقاء شیطانی طرح طرح کے حیل و مکائد بنا رکھے ہیں۔ اور جب وقت آتا ہے تو انہیں کی آڑ میں پناہ لیتے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ عملاً بالمعروف کا حکم ساقط و کالعدم ہو گیا۔ (ایضاً)

علمائے سوء کے رنگا رنگ حیلے بہانے

حضرت مولاناؒ اپنے عہد کے علماء سوء کے حیلوں بہانوں اور رنگ رنگ قسم کے جوابات کا خاکہ یوں پیش کرتے ہیں:

(یہ علماء) کبھی کہتے ہیں کہ درجۂ عزیمت و عزائم امور بہت بلند ہے ہمیں کہاں

نصیب؟ رخصت یہ ہے کہ بخوف نقصان جان و مال باطل پرستی قبول کر لی جائے۔
عَلٰی خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ وَ مَلَاْئِہِمْ اَنْ یَّفْتِنَہُمْ[1]
کبھی کہتے ہیں کہ صداقت موسوی سے انکار نہیں' لیکن ہیبت و سطوت فرعونی کے مقابلے کی طاقت نہیں رکھتے' پس خاموشی و ترک سعی کے سوا چارہ نہیں
فَاذْھَبْ اَنْتَ وَ رَبُّكَ وَ قَاتِلَآ اِنَّا ھٰھُنَا قٰعِدُوْنَ[2]
کبھی کہتے ہیں کہ اگرچہ حق اس کے خلاف ہے مگر مصلحت وقت کا مقتضیٰ یہی ہے۔ گویا مصلحت' حقائق اشیاء کو متغیر کر دے سکتی ہے۔
کبھی کہتے ہیں کہ زبان کھولنے میں فتنہ ہے۔ اور فقہاء کا ایک جزیہ ہم کو مل گیا ہے کہ فتنہ سے بچنا ضروری ہے۔ گویا حق میں فتنہ ہے اور سکوت عن الحق میں امن و سلامتی۔ وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَھْوَآئَھُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اور کبھی کہتے ہیں کہ عَلَیْکُمْ اَنْفُسَکُمْ اور لَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّھْلُکَۃِ پر ہمارا عمل ہے۔
یُحَرِّفُوْنَ الْکَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِہٖ
کبھی کہتے کہ فلاں فلاں باتیں یقیناً بدعات و منکرات میں داخل ہیں لیکن عوام صدیوں سے کر رہے ہیں اگر صاف صاف حق گوئی سے کام لیں گے تو بگڑ جائیں گے اور ہم کو بزرگ اور پیشوا نہیں سمجھیں گے۔ اگر ایسا ہوا تو موجودہ حالت سے بھی زیادہ نقصان ہو گا۔ اِنَّ کَثِیْراً مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّھْبَانِ لَیَاْکُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَ یَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ
کبھی کہتے ہیں کہ اس میں خوف جان ہے اور جان کا بچانا مشکل ہے۔

---

[1] یعنی فرعون اور اس کے اعیان سلطنت سے خوف کھاتے ہوئے کہ کہیں وہ ہمیں آزمائش کی گرداب میں نہ ڈال دے۔

[2] یعنی اے موسیٰ! تو اور تیرا رب دونوں جاؤ اور دشمن کے خلاف جنگ کرتے رہو ہم تو گوشہ عافیت میں رہیں گے۔

غرضیکہ یَعِدُهُمْ وَ یُمَنِّیْهِمْ وَ مَا یَعِدُهُمُ الشَّیْطٰنُ اِلاَّ غُرُوراً

یہ سب کچھ کہتے ہیں مگر اصلی بات نہیں کہتے کہ ایمان باللہ مفقود ہو گیا۔ حیات دنیوی کی محبت' محبت الٰہی پر غالب آ گئی۔ متاع دنیا کی دلفریبیوں پر روح مفتون اور دل نثار ہو گیا۔ اور دنیا پرستی کی لعنت نے عزم اور راستی کی روح کو مردہ کر دیا۔ (تذکرہ)

(حضرت مولانا آزادؒ ایسے علماء اور اصحاب فتویٰ کی خوب خبر لیتے ہیں جو شریعت حقہ میں تاویلات اور حیلوں اور بہانوں سے کام لیتے ہیں اور اس ضلالت کو تفقہ کا نام دیتے ہیں۔)

آپ مزید فرماتے ہیں:

"افسوس کہ وہی ہوا جس کا اس صادق و مصدوق ﷺ کو اندیشہ تھا۔ اور اس امت میں بھی ایسے صدوقی اور فریبی پیدا ہو گئے جنھوں نے بحکم حَذْوَا النَّعْلَ بِالنَّعْلِ ٹھیک ویسی ہی حیلہ بازیاں اور مکاریاں اسلام میں پیدا کر لیں ضَلُّوا فَاَضَلُّوا فَوَیْلٌ لَّهُمْ

(تذکرہ)

علمائے حق پر ظلم و ستم کی داستان خونچکاں

حضرت مولاناؒ ' علمائے حق پر ٹوٹنے والے ظلم اور پیش آنے والی داستان خونچکاں ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:۔

گزشتہ نصف صدی میں علمائے سوء و دجاجلۂ آخر الزماں نے ان الزاموں کے ذریعے کیسے کیسے مظالم و شدائد مصلحین امت و متبعین کتاب و سنت و داعیان دین الخالص پر نہیں کئے ہیں۔ اور اس دنیا کی کون سی مصیبت ہے جو ان پر نہیں لائی گئی ہے؟ اب تو یہ فتنہ کچھ کچھ دب چلا ہے' لیکن گزشتہ ساٹھ برس کے اندر نہ صرف

ہندوستان بلکہ اکثر بلاد اسلامیہ میں جو حالت رہ چکی ہے افسوس کہ تاریخ کا قلم اب تک اس سے آشنا نہ ہوا۔ ورنہ شاید پچھلے عہد فتن و مظالم کی کتنی ہی سرگزشتیں اس کے سامنے ہیچ نظر آتیں۔ اس فتنہ نے حق کی پامالی اور صلحاء امت کے قتل و غارت کے سارے ہتھیار اکٹھے کر دیئے تھے۔ جہاں کسی کو کتاب و سنت کا داعی اور بدعات و منکرات سے کنارہ کش دیکھا' جھٹ سے کہہ دیا کہ منہم۔ پھر مجرد اس الزام کے گویا اس بدنصیب کا خون مسلمانوں پر حلال ہو گیا۔ یہود و نصاریٰ اور مشرکین کو مسلمانوں کی بستیوں میں امن مل سکتا ہے لیکن اس "بدبخت" کے لیے کہیں پناہ نہیں۔ گھر سے بے گھر ان کو ہونا پڑا۔ مردود و مطعون خلائق وہ بنے' خدا کی عبادت گاہوں کے دروازے ان پر بند کئے گئے' کفر کے فتوؤں کا بے اختیار ہتھیار ان کے لیے حرکت میں آیا' حکومت وقت کو ان کے خلاف بھڑکایا گیا۔ کفار نہیں' خود مسلمانوں نے ان کے خلاف سازشیں کیں۔ بغاوت کا الزام لگا کر کسی کی جان پھانسی کے تختے پر لی گئی۔ اور کسی کو مدت العمر کے لیے کالے پانی بھجوا کر مسلمانوں نے جشن کیے۔ حتیٰ کہ جن مظلوموں نے جوار بیت اللہ اور بیت الرسول کو مَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا سمجھ کر کفر زار ہند سے ہجرت کی' ان کو وہاں بھی پناہ نہ ملی۔ کبوتروں کے غول مسجد حرام میں بے غم اڑتے ہیں۔ اور جانوران صحرائی کو اس دارالامن نے شکاریوں کی حیرانگیوں سے محفوظ کر دیا ہے مگر افسوس کہ عشاق کتاب و سنت کے لیے وہاں بھی امن نہ تھا۔ وہی خود ساختہ مذہبی الزام ان پر لگایا گیا۔

عین جوار حرم میں کسی مہاجر الی اللہ کے تازیانے لگائے گئے' کسی کو قید کیا گیا' کسی کا تمام مال و متاع مسلمانوں کے لیے مباح کر دیا گیا۔ جن لوگوں نے کفر و ظلم کی آبادیوں سے نکل کر اللہ کے گھر میں پناہ لی تھی' ان کو وہاں سے بھی نکالا گیا تھا...... اور یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ (وہ) قرآن کے چاکر اور رسول اللہ ﷺ سنت رسول اللہ ﷺ کے شیفتہ ہیں۔ (تذکرہ)

رسول برحق کی محبت و شیفتگی

ابوالکلام آزاد ماہ ربیع الاول کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

عزیزانِ ملت! ماہ ربیع الاول کا درود تمہارے لیے جشن و مسرت کا ایک پیغام عام ہوتا ہے کیونکہ تمہیں یاد آ جاتا ہے کہ اسی مہینے کے ابتدائی ہفتوں میں خدا کی رحمت عامہ کا دنیا میں ظہور ہوا۔ اور اسلام کے داعی برحق کی پیدائش سے دنیا کی دائمی غمگینیاں اور سرگشتگیاں ختم کی گئیں۔ صلی اللہ علیہ و علیٰ آلہ و صحبہ و سلم۔

تم خوشیوں اور مسرتوں کے ولولوں سے معمور ہو جاتے ہو۔ تمہارے اندر خدا کے رسول برحق کی محبت و شیفتگی ایک بے خودانہ جوش و محویت پیدا کر دیتی ہے........

تم اس کے ذکر و فکر کی مجلسیں منعقد کرتے ہو۔ ان کی آرائش و زینت میں اپنی محنت و مشقت کی کمائی بے دریغ لٹاتے ہو۔ خوشبودار اور تروتازہ پھولوں کے گلدستے سجاتے ہو۔ عطر و گلاب کی مہک اور اگر کی بتیوں کا بغور جب ایوان مجلس کو اچھی طرح معطر کر دیتا ہے تو اس وقت مدح و ثنا کے زمزموں اور درود و سلام کے مقدس ترانوں کے اندر اپنے محبوب و مطلوب مقدس کی یاد کو ڈھونڈتے ہو۔

پس کیا مبارک ہیں وہ دل جنھوں نے اپنے عشق و شیفتگی کے لیے رب السموٰت والارض کے محبوب کو چنا۔ اور کیا پاک و مطہرہ زبانیں جو سید المرسلین و رحمۃ للعالمینؐ کی مدح و ثنا میں زمزمہ سنج ہوئیں۔

جشن حصول و ماتم ضیاع

مولانا آزاد لکھتے ہیں اور کیا خوب لکھتے ہیں:

لیکن جبکہ تم اس ماہ مبارک میں یہ سب کچھ کرتے ہو۔ اور ماہ کے واقعۂ ولادت

کی یاد میں خوشیاں مناتے ہو' تو ان مسرتوں کے اندر تمہیں کبھی اپنا وہ ماتم بھی یاد آتا ہے؟ جس کے بغیر اب تمہاری کوئی خوشی نہیں ہو سکتی۔ کبھی تم نے اس حقیقت پر بھی غور کیا ہے کہ یہ کس کی پیدائش ہے؟ جس کی یاد کے لیے تم سروسامان جشن کرتے ہو ---- یہ کون تھا؟ جس کی ولادت کے تذکرہ میں تمہارے لیے خوشیوں اور مسرتوں کا ایسا عزیز پیام ہے۔

آہ! اگر اس مہینہ کی آمد تمہارے لیے جشن مسرت کا پیام ہے' کیونکہ اسی مہینہ میں وہ آیا جس نے تم کو سب کچھ دیا تو میرے لیے اس سے بڑھ کر اور کسی مہینے میں ماتم نہیں کیونکہ اس مہینے میں پیدا ہونے والے (برتر نبیؐ) والے کی یاد تازہ کرتا ہے' تو دوسری طرف کھونے والوں کے زخم کو بھی تازہ ہو جانا چاہیے۔ ؎

ماخانہ رمید گان ظلمیم

پیغام خوش از دیار ما نیست

تم اپنے گھروں کو مجلسوں سے آباد کرتے ہو مگر تمہیں اپنے دل کی اجڑی ہوئی بستی کی بھی کچھ خبر ہے؟ تم کافوری شمعوں کی قندیلیں روشن کرتے ہو مگر اپنے دل کی اندھیاری کو دور کرنے کے لیے کوئی چراغ نہیں ڈھونڈتے۔ تم پھولوں کے گل دستے سجاتے ہو مگر آہ تمہارے اعمال حسنہ کا پھول مرجھا گیا ہے۔ تم گلاب کے چھینٹوں سے اپنے رومال و آستین کو معطر کرنا چاہتا ہو' مگر آہ' تمہاری غفلت کہ تمہاری عظمت اسلامی کی عطر بیزی سے دنیا کی مشام روح یکسر محروم ہے۔

کاش! تمہاری مجلسیں تاریک ہوتیں۔ تمہارے آنکھیں رات بھر مجلس آرائیوں میں نہ جاگتیں۔ تمہاری زبانوں سے ماہ ربیع الاول کی ولادت کے لیے دنیا کچھ نہ سنتی مگر تمہاری روح کی آبادی معمور ہوتی' تمہارے دل کی بستی نہ اجڑتی' تمہارا طالع خفتہ بیدار ہوتا اور تمہیں زبانوں سے نہیں مگر تمہارے اعمال کے اندر سے اسوۂ نبوی کی مدح و ثنا کے ترانے اٹھتے۔

فرمان رحمت آیا

مولاناؒ فرماتے ہیں:

ماہ ربیع الاول کی یاد میں ہمارے لیے جشن و مسرت کا پیام اس لیے تھا کہ اسی مہینہ میں خدا کا وہ فرمان رحمت دنیا میں آیا' جس کے ظہور نے دنیا کی شقاوت و حرمانی کا موسم بدل دیا۔ ظلم و طغیان اور فساد و دھیان کی تاریکیاں مٹ گئیں۔ خدا اور اس کے بندوں کا ٹوٹا ہوا رشتہ جڑ گیا۔ انسانی اخوت و مساوات کی یگانگت نے دشمنیوں اور کینوں کو نابود کر دیا۔ اور کلمۂ کفر و ضلالت کی جگہ کلمۂ حق و عدالت کی پادشاہت کا اعلان عام ہو......

پھر آہ! تم اس کے آنے کی خوشیاں تو مناتے ہو' پر اس کے ظہور کے مقصد سے غافل ہو گئے ہو۔ اور وہ جس غرض کے لیے آیا تھا' اس کے لیے تمہارے اندر کوئی ٹیس اور چبھن نہیں۔

یہ ماہ ربیع الاول اگر تمہارے لیے خوشیوں کی بہار ہے تو صرف اس لیے کہ اس مہینہ میں دنیا کی خزان ضلالت ختم ہوئی اور کلمۂ حق کا موسم ربیع شروع ہوا۔ پھر اگر آج دنیا کی عدالت سموم ضلالت کے جھونکوں سے مرجھا گئی ہے۔ تو اے غفلت پرستو! تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ بہار کی خوشیوں کی رسم تو مناتے ہو مگر خزاں کی پامالیوں پر نہیں روتے۔

کچھ ہوش چاہیے

مولانا آزادؒ کس قدر صاف گوئی اور حقیقت بیانی سے کام لیتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

"تم ربیع الاول میں آنے والے (بزرگ و برتر نبیؐ) کی یاد اور محبت کا دعویٰ

رکھتے ہو اور مجلسیں منعقد کر کے مدح و ثنا کی صدائیں بلند کرتے ہو' لیکن تمہیں کبھی بھی یہ یاد نہیں آتا کہ جس کی یاد کا تمہاری زبان دعویٰ کرتی ہے' اس کی فراموشی کے لیے تمہارا ہر عمل گواہ ہے۔ اور جس کی مدح و ثنا میں تمہاری صدائیں زمزمہ سرا ہوتی ہیں اس کی عزت کو تمہارا ہر عمل بٹہ لگا رہا ہے ...... پس اگر ربیع الاول کا مہینہ دنیا کے لیے خوشی و مسرت کا مہینہ تھا تو صرف اس لیے کہ اسی مہینہ میں دنیا کا سب سے بڑا انسان آیا۔

پھر اے غفلت کی ہستیو! اور اے بے خبری کی سرگشتہ خواب روحو! تم کس منہ سے اس کی پیدائش کی خوشیاں مناتے ہو؟ جو حریت انسان کی بخشش' حیات روحی و معنوی کے عطیہ اور کامرانی وفیروز مندی کی خسروی و ملوکی کے لیے آیا تھا۔

اللہ اللہ ! غفلت کی نیرنگی اور انقلاب کی بوقلمونی! ماسویٰ اللہ کی عبودیت کی زنجیریں پاؤں میں ہیں۔ انسانوں کی مملوکیت و مرعوبیت کے حلقے گردنوں میں' ایمان باللہ کے ثبات سے دل خالی اور اعمال حقہ و حسنہ کی روشنی سے روح محروم! ان سامانوں اور تیاریوں کے ساتھ تم مستعد ہوئے ہو کہ ربیع الاول کے آنے والے (پاک پیغمبرؐ) کی یاد کا جشن مناؤ۔ جس کا آنا خدا کی بشارت اور امت عادلہ و قائمہ کے تمکن و قیام کی بنیاد تھا۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاک ذکر کی مجلس

کسی کے سوالات کا جواب دیتے ہوئے ابوالکلامؒ فرماتے ہیں:

"مولوی کی مجالس کا عجیب حال ہے مقصد مجلس کے لحاظ سے دیکھئے تو حقیر کے اعتقاد میں اس سے زیادہ اہم' عظیم المنفعت اور قوم کے لیے ذریعہ ارشاد و ہدایت اور کوئی اجتماع نہیں۔"

ذرا آگے چل کر لکھتے ہیں:

"پس مولود کی مجلسوں کا اصلی مقصد یہ ہوتا تھا کہ وہ اس اسوۂ حسنہ کے جمال الٰہی کی تجلی گاہ ہوتیں۔ آنحضرت ﷺ کے صحیح حالات سنائے جاتے۔ ان کے اخلاق عظیمہ اور خصائل کریمہ کے اتباع کی لوگوں کو دعوت دی جاتی۔ اور ان اعمال کا دلوں میں شوق و ولولہ پیدا کیا جاتا جو ایک مسلم و مومن زندگی کے کیریکٹر کا اصلی مایۂ خمیر ہیں۔ اور جن کے اتباع نے صحابہ کرامؓ کی زندگی کو اس درجہ تک پہنچا دیا تھا کہ لسان الٰہی نے يُحِبُّهُمْ وَ يُحِبُّوْنَهٗ کے صدائے محبت سے ان کی مدح سرائی کی اور اتباع محبوب نے ان کو خود محبوب بنا دیا قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِي يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ"۔

مجالس مولود میں بے سروپا قصے

کسی صاحب نے مولانا ابوالکلام آزادؒ سے مجالس مولود پر بیان کئے جانے والے چند معجزات اور قصص و روایات کی صحت کے بارے میں استفسار کیا حضرت مولانا نے اس کا بڑا محققانہ اور عالمانہ جواب ارشاد فرمایا۔ جو یہ ہے:

جواباً گذارش ہے کہ روایات تو یقیناً صحیح نہیں ہیں۔ لیکن یہ اصول بھی کب صحیح ہے کہ جو واقعہ آپ کی عقل میں نہ آئے وہ یکسر غلط و موضوع [1] ہو؟ آپ بلا تامل پوچھئے کہ یہ واقعات اصول فون روایت کی بنا پر کہاں تک صحیح اور قابل قبول ہیں۔ اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ صرف اتنا پوچھ لینا ہی آپ کے مقصد کے

---

[1] سائل نے روایات کی صحت کی بابت دریافت کرنے کے ساتھ یہ بھی پوچھا کہ اگر یہ روایات صحیح ہیں تو کیا عقل میں آ سکتی ہیں؟ مولانا ابوالکلام جو جواب ارشاد فرمایا اس سے نہ صرف ان کا مسلک عیاں ہوتا ہے بلکہ دقت نظر اور وسعت معلومات کا بھی خوب اندازہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو کس قدر محقق اور جامع العلوم بنا دیا تھا۔ و ذالک فضل اللّٰہ یوتیہ من یشاء (فاروقی)

حصول کے لیے کافی ہے ....

آپ نے جن روایات کی نسبت استفسار کیا ہے ان میں سے ایک بھی واقعہ ایسا نہیں جو اصول فن حدیث کی بنا پر صحیح تسلیم کیا جا سکے۔ اور جن کو سن کر کتب معتبرہ محدثین میں روایت کیا گیا ہو۔ صحاح ان نقص سے خالی ہے۔ عام مسانید و معاجم اور مصنفات مشہورہ میں بھی کوئی لائق احتجاج ثبوت نہیں ملتا۔ حافظ سیوطیؒ نے "جمع الجوامع" میں جمع احادیث کا پورا التزام کیا ہے لیکن یہ کیسی عجیب بات ہے کہ ان روایات کا اس میں کہیں پتہ نہیں"۔

اتفاق

اتفاق کی خوبیاں بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"اتفاق' آہ تم کیا جانو اتفاق کیا چیز ہے؟ اتفاق ایک سفید کبوتر ہے جو اپنی چونچ میں زیتون کی شاخ لئے ہوئے نا اتفاقی کے طوفان سے نجات دلانے کی خوشخبری سنا رہا ہے۔

اتفاق' چہچہاتی ہوئی بلبل ہے اور اپنی شیریں رگوں سے غمزدہ دلوں میں طرب پیدا کر رہی ہے۔

اتفاق' خوبصورت عندلیب ہے' آسمان میں اڑتی چلی جاتی ہے اور وہاں سے نسیم جنت بن کر واپس آتی ہے۔

اتفاق' آسمانی فرشتہ ہے جو اپنے نورانی پر' بہادر روحوں پر پھیلا دیتا ہے۔"

انسان فرشتوں سے بہتر ہے

انسان ہی ہے جو فرشتوں سے بہتر ہے اگر اپنی قوتوں کو امن و سلامتی کا وسیلہ بنائے۔ اور انسان ہی ہے جو سانپ کے زہر اور بھیڑیے کے پنجے سے بھی زیادہ

خونخوار ہے اگر راہ امن و سلامتی کو چھوڑ کر بہیمیت اور خونخواری پر اتر آئے.....

یہی انسانیت اعلیٰ اور ملوکیت عظمیٰ ہے جس کی تقویم و تکمیل کے لیے دین الٰہی اور شریعت فطری کا ظہور ہوا۔ اور یہی پیغام امن' رہنمائے صلح و صلاح اور وسیلہ فوز و فلاح جس کا دوسرا نام اسلام ہے یعنی جنگ کی جگہ صلح' خون و ہلاکت کی جگہ عمران و حیات اور بردباری و خرابی کی جگہ سلامتی و امنیت ہے۔ وہ بتلاتا ہے کہ اگر انسان اپنی قوت ملکوتی اور فطرت صالح سے کام نہ لے تو وہ بڑے ہی گھاٹے میں ہے۔

وہ اشرف المخلوقات کی صورت میں آدمی' خواہشوں میں بھیڑیا' محل سراؤں میں متمدن انسان' مگر میدانوں میں جنگلی درندہ اور اپنے ہاتھ پاؤں سے اشرف المخلوقات مگر اپنی روح بہیمی سے دنیا کا سب سے بڑا خونخوار جانور ہے۔

وہ کل تک اپنے کتابوں کے گھروں اور علم و تہذیب کے دارالعلوموں میں انسان تھا۔ یہ آج چیتے کی کھال اس کی نرمی سے زیادہ حسین اور بھیڑیئے کے پنجے اس کے دندان تبسم سے زیادہ تیز ہیں۔ شیر خونخوار ہے مگر غیروں کے لیے' سانپ زہریلا ہے مگر دوسرے کے لیے' چیتا درندہ ہے مگر اپنے سے کمتر جانوروں کے لیے' لیکن انسان دنیا کا اعلیٰ ترین مخلوق خود اپنے ہی ہم جنسوں کا خون بہاتا اور اپنے ہی ابنائے نوع کے لیے درندہ و خونخوار ہے۔

انسانیت کی بستی اجاڑ ہو گئی

اب انسانوں کی بستیاں اور اولاد آدم کی آبادیاں راحت کی سانس اور امن کے تنفس سے خالی ہو گئی ہیں۔ کیونکہ وہ جو خدا کی زمین پر سب سے اچھا اور سب سے برا اور سب سے کمتر ہو جائے' تو جس طرح اس سے زیادہ کوئی نیک نہ تھا ویسا ہی اس سے بڑھ کر اور کوئی برا بھی نہیں ہو سکتا۔

انسانیت کی بستی اجاڑ ہو گئی' نیکی کا گھر لوٹ لیا گیا اور دنیا مثل اس ویرانہ کے ہو

گئی جس کا شوہر زبردستی قتل کر دیا گیا ہو اور اس کے یتیم بچوں پر رحم نہ کیا گیا ہو۔ اب وہ اپنے لٹے ہوئے سنگھار پر ماتم کرے گی۔ اور اپنی پھٹی ہوئی چادر کو سر سے اتار دے گی کیونکہ اس کا حسن زخمی ہو گیا کیونکہ اس کا شباب پامال کر دیا گیا۔

انسان کی دلچسپیوں کا عجیب حال

انسان کی بے مہریوں کی طرح اس کی دلچسپیوں کا بھی کیسا عجیب حال ہے۔ وہ عجیب عجیب اور غیر معمولی باتیں دیکھ کر خوش ہوتا ہے لیکن اس کی پرواہ نہیں کرتا کہ اس کی دلچسپی کا یہ تماشا کیسی کیسی مصیبتوں اور شقاوتوں کی پیدائش کے بعد ظہور میں آسکا۔ اگر ایک چور دلیری کے ساتھ چوری کرتا ہے تو یہ اس کے لیے بڑی ہی دلچسپی کا واقعہ ہے۔ وہ اس کی صورت دیکھنے کے لیے بے قرار ہو جاتا ہے۔ وہ گھنٹوں اس پر رائے زنی کرتا ہے اور وہ تمام اخبارات خرید لیتا ہے جن میں اس کی تصویر چھپی ہو یا اس کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ لیکن اس واقعہ میں چوری کے لیے کیسی شقاوت ہے اور جس مسکین کا مال چور ہو گیا اس کے لیے کیسی مصیبت ہے' اس کے سوچنے کی وہ کبھی زحمت گوارا نہیں کرتا۔

برائی بہر صورت برائی ہے

برائی میں کم و کیفیت کے اعتبار سے تقسیم کی جا سکتی ہے لیکن حسن و قبح کے اعتبار سے اس کی ایک ہی قسم ہے۔ یعنی اس اعتبار سے تقسیم ہو سکتی ہے کہ وہ کتنی ہے اور کیسی ہے؟ اس اعتبار سے نہیں ہو سکتی کہ وہ اچھی ہے' یا بری ہے۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ زیادہ بری چوری' کم بری چوری' لیکن یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ اچھی چوری اور بری چوری۔

پس میں بیوکریسی کی اچھائی اور جائز ہونے کا کسی حال میں بھی تصور نہیں کر سکتا

کیونکہ وہ فی نفسہٖ ایک ناجائز عمل ہے۔ البتہ اس کی برائی کم اور زیادہ ہو سکتی ہے۔

اسلام اور بیورو کریسی

میں مسلمان ہو اور بحیثیت مسلمان ہونے کے بھی میرا مذہبی فرض یہی ہے۔ اسلام کسی ایسے اقتدار کو جائز تسلیم نہیں کر سکتا جو شخصی ہو یا چند تنخواہ دار حاکموں کی بیورو کریسی ہو۔ وہ آزادی اور جمہوریت کا ایک مکمل نظام ہے جو نوع انسانی کو اس کی چھینی ہوئی آزادی واپس دلانے کے لیے آیا تھا۔ یہ آزادی بادشاہوں' اجنبی حکومتوں خود غرض مذہبی پیشواؤں اور سوسائٹی کی طاقتور جماعتوں نے غصب کر رکھی تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ حق' طاقت اور قبضہ ہے۔ لیکن اسلام نے ظاہر ہوتے ہی اعلان کیا کہ حق' طاقت نہیں بلکہ خود حق ہے۔ اور خدا کے سوا کسی انسان کو سزاوار نہیں کہ بندگان خدا کو اپنا محکوم اور غلام بنائے۔ اس نے امتیاز اور بالادستی کے تمام قومی اور نسلی مراتب یک قلم مٹا دیئے۔ اور دنیا کو بتلا دیا کہ سب انسان درجے میں برابر ہیں اور سب کے حقوق مساوی ہیں۔ نسل' قومیت' رنگ' معیار فضیلت نہیں ہے بلکہ صرف عمل ہے۔ اور سب سے بڑا وہی ہے جس کے کام سب سے اچھے ہوں۔

اسلام ایک جمہوری نظام ہے

انسانی حقوق کا یہ وہ اعلان ہے جو انقلاب فرانس سے گیارہ سو برس پہلے ہوا۔ یہ صرف اعلان ہی نہ تھا بلکہ ایک عملی نظام تھا جو مشہور مؤرخ گبن کے لفظوں میں۔

"اپنی کوئی مثال نہیں رکھتا۔"

پیغمبر اسلام ﷺ اور ان کے جانشینوں کی حکومت ایک مکمل جمہوریت تھی۔ اور صرف قوم کی رائے' نیابت اور انتخاب سے اس کی بناوٹ ہوتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کی اصطلاح میں جیسے جامع اور عمدہ الفاظ اس مقصد کے لیے موجود ہیں

شاید (ہی) دنیا میں کسی زبان میں پائے جائیں۔

اسلام نے "بادشاہ" کے اقتدار اور شخصیت سے انکار کیا ہے اور صرف ایک رئیس جمہوریت (پریذیڈنٹ آف ری پبلک) کا عہدہ قرار دیا ہے۔ لیکن اس کے لیے بھی خلیفہ کا لقب تجویز کیا۔ جس کے لغوی معنی نیابت کے ہیں گویا اس کا اقتدار محض نیابت ہے۔

اسی طرح قرآن نے نظامِ حکومت کے لیے "شوریٰ" کا لفظ استعمال کیا وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ۔ چنانچہ ایک پوری سورت اسی نام سے قرآن مجید میں موجود ہے۔ "شوریٰ" کے معنی باہم مشورہ کے ہیں۔ یعنی جو کام کیا جائے جماعت کے باہم رائے اور مشورہ سے کیا جائے۔ شخصی رائے اور حکم سے نہ ہو۔ اس سے زیادہ صحیح نام جمہوری نظام کے لیے کیا ہو سکتا ہے؟

اسلامی توحید

اسلام کی بنیاد عقیدۂ توحید پر ہے۔ اور توحید کا ضد شرک ہے جس سے بیزاری اور نفرت ہر مسلمان کی فطرت میں داخل کی گئی ہے۔

توحید سے مقصود یہ ہے کہ خدا کو اس کی ذات اور صفات میں ایک ماننا۔ شرک کے معنی یہ ہیں کہ اس کی ذات اور صفتوں میں کسی دوسری ہستی کو شریک کرنا۔

پس سچائی کے اظہار میں بے خوفی اور بے باکی ایک مسلمان کی زندگی کا مایۂ خمیر ہے۔ توحید مسلمانوں کو سکھاتی ہے کہ ڈرنے اور جھکنے کی سزاوار صرف خدا ہی کی عظمت و جبروت ہے۔ اس کے سوا کوئی نہیں جس سے ڈرنا چاہیے یا جس کے آگے جھکنا چاہیے۔ وہ یقین کرتے ہیں کہ خدا کے سوا کسی دوسری ہستی سے ڈرنا' خدا کے ساتھ اس کو شریک کرنا اور اپنے دل کے خوف و اطاعت کا حق دار ماننا ہے' یہ بات توحید کے ساتھ اکٹھی نہیں ہو سکتی۔ اس لیے اسلام تمام تر بے خوفی اور قربانی کی

دعوت ہے۔

حالات کا انقلاب

میں سچ کہتا ہوں مجھے اس کی رائی برابر بھی شکایت نہیں کہ سزا دلانے کے لیے مجھ پر مقدمہ چلایا گیا ہے' یہ بات تو بہرحال ہونی ہی تھی۔ لیکن حالات کا یہ انقلاب میرے لیے بڑا ہی درد انگیز ہے کہ ایک مسلمان سے کتمان شہادت کی توقع کی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ وہ ظلم کو صرف اس لیے ظلم نہ کہے کہ دفعہ ۱۲۴۔ الف کا مقدمہ چلایا جائے گا۔

آزادی یا موت

انسانوں کی بد عملی سے کسی تعلیم کی حقیقت نہیں جھٹلائی جا سکتی۔ اسلام کی تعلیم اس کی کتاب میں موجود ہے وہ کسی حال میں بھی جائز نہیں رکھتی کہ آزادی کھو کر مسلمان زندگی بسر کریں۔ مسلمانوں کو مٹ جانا چاہیے یا آزاد رہنا چاہیے' تیسری راہ اسلام میں کوئی نہیں۔

اسی لیے میں نے آج سے بارہ سال پہلے "الہلال" کے ذریعہ مسلمانوں کو یاد دلایا تھا کہ آزادی کی راہ میں قربانی و جانفروشی ان کا قدیم اسلامی ورثہ ہے۔ ان کا اسلامی ورثہ ہے۔ ان کا اسلامی ورثہ یہ ہے کہ ہندوستان کی تمام جماعتوں کو اس راہ میں اپنے پیچھے چھوڑ دیں۔ میری صدائیں بے کار نہ گئیں۔ مسلمانوں نے اب آخری فیصلہ کر لیا ہے کہ اپنے ہندو' سکھ' عیسائی' پارسی بھائیوں کے ساتھ مل کر اپنے ملک کو (انگریز کی) غلامی سے نجات دلائیں گے۔

مجرموں کا عظیم الشان کٹہرا

عدالت کی نا انصافیوں کی فہرست بڑی ہی طولانی ہے۔ تاریخ آج تک اس کے ماتم سے فارغ نہ ہو سکی۔ ہم اس میں حضرت مسیح علیہ السلام جیسے پاک انسان کو دیکھتے ہیں جو اپنے عہد کی اجنبی عدالت کے سامنے چوروں کے ساتھ کھڑے کیے گئے۔

ہم کو اس میں سقراط نظر آتا ہے' جس کو صرف اس لیے زہر کا پیالہ پینا پڑا کہ وہ اپنے ملک کا سب سے زیادہ سچا انسان تھا۔

ہم کو اس میں فلورنس کے فدا کار حقیقت گلیلیو کا نام بھی ملتا ہے جو اپنی معلومات و مشاہدات کو اس لیے جھٹلا نہ سکا کہ وقت کی عدالت کے نزدیک ان کا اظہار جرم تھا........ یہ مجرموں کا کٹہرا کیسی عجیب مگر عظیم الشان جگہ ہے جہاں سب سے اچھے اور سب سے برے' دونوں طرح کے آدمی کھڑے کیے جاتے ہیں۔

خواب گاہ عیش میں وہ خوشی اور راحت کہاں

اس جگہ کی عظیم الشان اور عمیق تاریخ پر جب میں غور کرتا ہوں اور دیکھتا ہوں کہ اسی جگہ کھڑے ہونے کی عزت آج میرے حصہ میں آئی ہے تو بے اختیار میری روح خدا کی حمد و شکر میں ڈوب جاتی ہے۔ اور صرف وہی جان سکتا ہے کہ میرے دل کے سرور و نشاط کا کیا عالم ہوتا ہے۔

میں مجرموں کے اس کٹہرے میں محسوس کرتا ہوں کہ بادشاہوں کے لیے قابل رشک ہوں۔ ان کو اپنی خواب گاہ عیش میں وہ خوشی اور راحت کہاں نصیب' جس سے میرے دل کا ایک ایک ریشہ معمور ہو رہا ہے۔ کاش! غافل اور نفس پرست انسان اس کی ایک جھلک ہی دیکھ پائے۔ اگر ایسا ہوتا تو میں سچ کہتا ہوں کہ لوگ اس جگہ کے لیے دعائیں مانگتے۔

اجتماعِ ضدین

پریشانی گورنمنٹ کو خود اسی کی منافقانہ روش کی وجہ سے پیش آ رہی ہے۔ ایک طرف تو وہ چاہتی ہے کہ شخصی حکمرانوں کی طرح بے دریغ جبر و تشدد کرے۔ دوسری طرف چاہتی ہے کہ نمائشی قانون و عدالت کی آڑ بھی قائم رہے۔ یہ دونوں باتیں متضاد ہیں' جمع نہیں ہو سکتیں' نتیجہ یہ ہے کہ اس کی پریشانی و درماندگی روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔

ظالم گورنمنٹ

یقیناً میں نے کہا ہے موجودہ گورنمنٹ ظالم ہے۔ لیکن اگر میں یہ نہ کہوں تو اور کیا کہوں؟ میں نہیں جانتا کہ کیوں مجھ سے یہ توقع کی جائے کہ ایک چیز کو اس کے اصلی نام سے نہ پکاروں۔ میں سیاہ کو سفید کہنے سے انکار کرتا ہوں۔ میں کم سے کم اور نرم سے نرم لفظ جو اس بارے میں بول سکتا ہوں یہی ہے۔ ایسی ملفوظ صداقت جو اس سے کم ہو میرے علم میں کوئی نہیں۔

میں یقیناً یہ کہتا رہا ہوں کہ ہمارے فرض کے سامنے دو ہی راہیں ہیں' گورنمنٹ ناانصافی اور حق تلفی سے باز آ جائے۔ اگر باز نہیں آ سکتی تو ہٹا دی جائے۔ میں نہیں جانتا کہ اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے۔

شخصی اقتدار بالذات ظلم ہے

میرا اعتقاد ہے کہ آزاد رہنا ہر فرد اور قوم کا پیدائشی حق ہے۔ کوئی انسان یا انسانوں کی گھڑی ہوئی بیوروکریسی' یہ حق نہیں رکھتی کہ خدا کے بندوں کو اپنا محکوم

بنائے۔ محکومی اور غلامی کے لیے کیسے ہی خوشنما نام کیوں نہ رکھ لیے جائیں لیکن وہ غلامی ہی ہے۔ اور خدا کی مرضی اور اس کے قانون کے خلاف ہے۔ پس میں موجودہ گورنمنٹ کو جائز حکومت تسلیم نہیں کرتا۔ اور اپنا ملکی' مذہبی اور انسانی فرض سمجھتا ہوں کہ اس کی محکومی سے ملک و قوم کو نجات دلاؤں۔
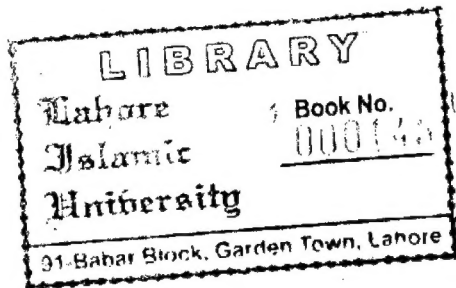
حدیث اور سیرت وسوانح پر
مُسلم پبلیکیشنز کی شہرہ آفاق کتب

کتاب	مصنف	تعارف
* پیارے نبی کی پیاری باتیں	مولانا عبدالمجید سوہدرویؒ	بچوں کے لیے حدیث کی چار کتب کا سیٹ۔
* انتخابِ صحیحین (اُردو)	مولانا عبدالمجید سوہدرویؒ	بخاری ومسلم کی احادیث کی روشنی میں روزمرہ زندگی کے بیسیوں مسائل کا خوبصورت حل پیش کیا گیا ہے۔
* نبیٔ رحمت ﷺ	مولانا محمد ادریس فاروقی	حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی شانِ رحمۃ للعالمینی کو قرآن وحدیث اور سیرت کے حوالہ جات سے اُجاگر کیا گیا ہے۔
* مقامِ رسالت	مولانا محمد ادریس فاروقی	حضرت ختمی مرتبت ﷺ کی شان اور فرمان کی عظمت کو دلنشین پیرائے میں بدلائل آشکارا کیا گیا ہے۔
* ہندو شعراء کا نعتیہ کلام	مولانا عبدالمجید سوہدرویؒ	اس کتاب میں ہندو سکھ وغیرہ شعراء کا قدیم وجدید نعتیہ کلام جمع کیا گیا ہے۔
* سیرت سیدہ خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ عنہا	مولانا محمد ادریس فاروقی	موضوع پر سب سے جامع اور قابلِ مطالعہ کتاب ہے۔
* سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا	مولانا محمد ادریس فاروقی	سیرت وسوانح کی دنیا میں حدیث وتاریخ کے مستند حوالہ جات کی روشنی میں ایک نئی پیشکش۔
* سیرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا	مولانا عبدالمجید سوہدرویؒ	مختصر اور جامع مقبول عام کتاب، نئی آب وتاب کے ساتھ..... چوتھا ایڈیشن
* سیرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا	مولانا عبدالمجید سوہدرویؒ	سیدہ محترمہؓ کے حالات زندگی کا بہترین مرقع، جس کا مطالعہ ہر بہن اور بیٹی کے لیے ضروری ہے۔
* دولت مند صحابہ رضی اللہ عنہم	مولانا عبدالمجید سوہدرویؒ	اس کتاب میں دولت مند صحابہ رضی اللہ عنہم کے دولت کمانے اور لگانے کے واقعات کو خوبصورتی سے یکجا کیا گیا ہے۔
* سیرت حسین رضی اللہ عنہ	مولانا محمد ادریس فاروقی	سیدنا حسینؓ ابن حیدرؓ کے فضائل ومناقب اور واقعات کربلا کے تاریخی معتبر حوالہ جات پر مشتمل نادر شہ پارہ۔